معین الدین

سَ سَا سِ سی سُ سُو
سے سَے سو سَو

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

اُردو کیسے پڑھائیں

۱۔ زبان کی نوعیت

زبان:

زبان ایک عضو تکلم بھی ہے اور بول بھی یہاں زبان کے آخر الذکر مفہوم سے مراد ہے جس کے تحت عضو تکلم سے مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان آوازوں کے پیدا ہونے کے دو اسباب ہیں ایک یہ کہ بولنے والے کا اپنا کوئی تقاضا ہوتا ہے دوسرے یہ کہ کسی خارجی تقاضے کے تحت لسانی ردعمل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے زبان میں مہمل اور بامعنی دونوں قسم کی آوازیں شامل ہیں۔

زبان کے ذریعے انسان اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں کے خیالات کو اخذ کرتا ہے۔ اظہار و اخذ کا یہ عمل علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ گویا زبان بامعنی آوازوں اور ان کی علامتوں کا مجموعہ ہے جس کے توسط سے انسان، بول کر یا لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں کے خیالات اخذ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے زبان کے دائرے میں تمام حروف اور تمام الفاظ یا الفاظ کے مجموعے شامل ہیں۔ ان کے درمیان ایک داخلی ربط ہوتا ہے اس لیے علامات و کلمات کے اس صوری و معنوی نظام کی بڑی اہمیت ہے۔

اس قدیم تصور کے مقابلے میں زبان کا جدید تصور نشو و نمائی اور ارتقائی ہے جس کے تحت زبان کو شخصیت کی نشو و نما کا ایک موثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے گویا زبان کو علامات و کلمات کے منطقی نظام سے بالاتر مانا گیا ہے۔

ابلاغ و اظہار کے لیے انسان جو زبان استعمال کرتا ہے وہ جب علامات میں ظاہر کی جائے تو تحریری زبان بن جاتی ہے۔ یہ زبان لکھے ہوئے حروف پر مشتمل ہوتی ہے اور ترقی

کرتے کرتے ادبی زبان بن جاتی ہے۔ جس کے ذریعے انسانی تجربات کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور آئندہ نسلوں تک پہنچایا جاتا ہے۔

زبان کا علاقہ وسیع ہوتا ہے۔ ایک خطے کے رہنے والے لوگ عام طور پر ایک ہی زبان بولتے ہیں جو اس خطے کی علاقائی زبان کہلاتی ہے۔ ہندستان میں ریاستوں کی تقسیم انھیں علاقائی زبانوں کی بنیاد پر عمل میں آئی ہے۔

زبان میں تبدیلی بہت کم ہوتی ہے عام طور پر زبان کا ایک معیار مقرر ہوتا ہے اور اُس اعتبار سے زبان کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ زبان میں تبدیلی اس وقت عمل میں آتی ہے جب کوئی بڑی سماجی تبدیلی رو نما ہو، ورنہ عام طور سے زبان کے معیار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ زبان کوئی جامد چیز نہیں۔ پھر ہر زبان کی اپنی علاحدہ شخصیت ہوتی ہے جو معاشی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ نمو پذیر رہتی ہے۔ اس اعتبار سے زبان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور دیگر زبانوں اور تہذیبوں سے اخذ و قبول کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

بولی:

زبان جس خطے میں بولی جاتی ہے اس میں عام طور پر چھوٹے چھوٹے علاقوں میں مقامی بولیاں بھی بولی جاتی ہیں۔ لیکن مختلف بولیوں میں اس بنا پر تمیز نہیں کی جا سکتی کہ کوئی ایک بولی دوسری سے برتر ہے۔ زبان، مقامی بولیوں سے ہی توانائی حاصل کرتی ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہر زبان مختلف بولیوں میں تقسیم ہوتی ہے، ہوتا یہ ہے کہ ایک بڑے علاقے کے لسانی گروہ میں وقت اور زمانے کے ساتھ مقامی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں خصوصیات کے باعث زبان مختلف بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک بولی کے بولنے والے عموماً ایک ہی طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں، تاہم ان کی انفرادی بولیوں میں فرق ہوتا ہے۔

بولی ایک غیر معیاری زبان ہوتی ہے جو کسی خطے کے عوام میں رائج ہو جاتی ہے لیکن اس کی کوئی تنظیم نہیں ہوتی اور نہ اس کی کوئی ادبی حیثیت ہوتی ہے۔ بولی وہ مقامی زبان ہے جس میں عام طور پر لوگ بات چیت کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی قواعد ہوتی ہے چنانچہ ایک ہی خطے کے بولنے والوں کی بولی میں فرق ہوتا ہے۔

زبان کا علاقہ جس قدر وسیع ہوگا وہاں اسی قدر زیادہ بولیاں ہوں گی۔ اگر وہاں کے رہنے

والوں کا آپس میں میل جول کم ہو گا تو اس بات کا امکان ہے کہ وہاں بولیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ ہمارے ملک میں بہت سے قبائلی علاقے ہیں اور ان میں سے بعض بالکل ہی غیر متمدن ہیں جن میں نقل مکانی کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں اس لیے ان علاقوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ کہیں کسی بولی میں تلفظ کا اختلاف پایا جاتا ہے تو کہیں لفظیات کا۔ کہیں بولی ترقی یافتہ ہو کر زبان کا منصب اختیار کر لیتی ہے اور کہیں وہ بولی ہی رہ جاتی ہے۔

زبان کی تشکیل:۔

ہر زبان کا اپنا ایک نظام ہے، ایک ایسا نظام جو مختلف سطحوں پر کار فرما اور مختلف عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں صرفی نحوی خصوصیات، الفاظ اور جملے بنیادی ساخت کا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا زبان کی بنیادی ساخت کا علم حاصل کیے بغیر زبان سیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ زبان استعمال کرنے والا اگر اس نظام سے واقف نہ ہو جس سے زبان کی تشکیل ہوئی ہے تو وہ صحیح طور پر زبان کا استعمال نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دو آدمی جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ایک دوسرے کی بات اس لیے سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس زبان کے نظام سے واقف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی بولنے والے دو اشخاص ایک دوسرے کی بات اس لیے سمجھ لیتے ہیں کہ وہ دونوں انگریزی زبان کے نظام سے واقف ہیں۔ لیکن عدمِ واقفیت کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جس حد تک زبان کے نظام کا علم پختہ ہو گا اسی حد تک سہولت اور معنویت کے ساتھ زبان کا استعمال ہو سکے گا۔

ایک شخص جب دوسرے کی گفتگو سنتا ہے تو یہاں صرف یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس زبان کے نظام سے واقف ہے بلکہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ سنی ہوئی آوازوں کے نظام کو مفہوم دے سکے۔ اس پیچیدہ عمل کے دوران سامع، ان آوازوں کی شناخت کرتا ہے جنھیں وہ سنتا ہے۔ شناخت کے عمل میں صوتی اکائیوں سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر سامع مختلف صوتی اکائیوں میں ایک دوسرے سے امتیاز کرتا ہے لیکن اس کے لیے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے۔

بعض مکتبِ خیال کے اساتذہ اور ماہرین اس دعوے کو کلیتاً تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے

ہم اردو کیسے پڑھائیں

یال میں غیر مادری زبان سکھانے کے لیے زبان کے نظام سے واقفیت ضروری ہے لیکن مادری
زبان سیکھنے میں زبان کے نظام سے واقفیت ضروری نہیں۔ ہم آپ اگر اپنے بچپن پر ایک نظر
ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زبان' زبان کے نظام سے واقفیت کی بنیاد پر نہیں سیکھی۔ بچہ
اپنی مادری زبان کیسے سیکھتا ہے اس کو شماریات اور لسانیات کے مختلف تحلیلی ضابطوں
سے نہیں طے کیا جا سکتا۔ زبان ایک اکتسابی اور سماجی عمل ہے خاص طور سے مادری زبان؛
لہذا ہر شخص اس طرح زبان سیکھتا ہے جس طرح کھانا' پینا اور دوڑنا سیکھتا ہے۔

زبان بنیادی طور پر ایک انسانی عمل ہے انسان اور سماج چونکہ لازم ملزوم ہیں اسی
لیے زبان کے استعمال میں قائل اور سامع دونوں کی موجودگی لازمی ہے۔ زبان کی ابتدائی صورت
اس بات چیت کی شکل میں نظر آتی ہے جو قائل اور سامع کے درمیان ہوتی ہے۔ دوسری شکل وہ
ہے جو پڑھائی اور تحریر میں نظر آتی ہے۔ اوّل الذکر کو آخر الذکر پر اس اعتبار سے فوقیت
حاصل ہے کہ یہ زندہ اور متحرک ہوتی ہے اس کے مقابلے میں تحریری زبان جامد ہوتی ہے۔

زبان کی تشکیل میں اوّلیں اہمیت آوازوں کی ہے اس کے بعد ان آوازوں کی علامت
یعنی حروف اور آخر میں جملے کی اہمیت مسلّم ہے بول چال میں عام طور پر جملے ہی استعمال کیے
جاتے ہیں۔ گویا بول چال کی اکائی 'جملہ' ہے۔

مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں جملے کی تین ٹکڑے کیے ہیں:

۱. سادہ آوازیں اور ان کی تحریری نقل یا علامتیں' جن کا نام حروف ہے۔ اس حصے کا نام
ہجا ہے۔

۲. ایک سے زیادہ ملی جلی آوازیں جن کی تحریری علامتیں الفاظ کہلاتی ہیں۔ ان کی تقسیم
اور ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے ان میں جو تغیر و تبدل ہوتا ہے یا ان میں کچھ
اضافے سے جو نئی صورت پیدا ہوتی ہے یعنی الفاظ کی تقسیم' گردان اور اشتقاق سے
بحث ہوتی ہے اس دوسرے حصے کا نام صرف ہے۔

۳. بات چیت یا جملے میں لفظوں کا ایک دوسرے سے اور جملوں کا جو باہمی تعلق ہوتا ہے
اس کو نحو کہتے ہیں۔ زبان کی تشکیل میں بنیادی طور پر تین عناصر شامل ہوتے ہیں حروف
الفاظ اور جملے۔ حروف سے متعلق علم کو علم ہجا، الفاظ سے متعلق علم کو صرف اور جملوں

سے متعلق علم کو نحو کہتے ہیں۔ ذیل میں ان تینوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

ہجا: حروف کا اعراب سے ظاہر کرنا لیکن حروف ہجا کہیں گے تو وہاں الف، بے، تے، سے مراد ہوگی۔

صرف: ایک علم کا نام ہے جس میں کلمے کی تقسیم، تعلیل، اشتقاق اور اس کی اصل اور گردان کا حال معلوم ہوتا ہے۔

نحو: وہ علم ہے جس میں کلمات کا جوڑنا، کھولنا اور ان کا باہمی تعلق یعنی لگاؤ معلوم ہو۔" (فرہنگ آصفیہ)

آدمی جب بولتا ہے تو اس کے منہ سے کوئی نہ کوئی آواز نکلتی ہے۔ یہ آوازیں بول کی شکل میں نکلتی ہیں۔ اسی بول کو ہم لفظ کہتے ہیں۔ بولتے وقت لفظ ہی بولا جاتا ہے یا جملے۔ لیکن بولے ہوئے لفظ دو قسم کے ہوتے ہیں .... موضوع اور مہمل۔ موضوع الفاظ وہ ہیں جو بامعنی ہوتے ہیں۔ جیسے میز، کرسی، چاقو، پنسل، قلم، وغیرہ — مہمل الفاظ ان الفاظ کو کہتے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے جیسے روٹی کے ساتھ ووٹی لگا دیں یا پانی کے ساتھ وانی لگا دیں۔ مہمل الفاظ بے معنی ہونے کے باوجود موضوع الفاظ کے ساتھ جب استعمال ہوتے ہیں تو کلام میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔

قواعد کے ماہرین نے موضوع الفاظ کی بھی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ترکیبی اور معنوی۔ اگر ترکیبی لحاظ سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ الفاظ مفرد ہوتے ہیں یا مرکب۔ مثلاً روٹی اور جیب مفرد الفاظ ہیں، لیکن جب دو لفظوں کو ملا کر کوئی لفظ بنایا جاتا ہے تو اُسے مرکب کہتے ہیں جیسے توشہ خانہ، کم گو، ان پڑھ وغیرہ معنوی لحاظ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ الفاظ تین قسم کے ہوتے ہیں، حقیقی، مجازی اور اصطلاحی۔ ان تینوں کے استعمال سے ہی زبان و بیان میں خوبی پیدا ہوتی ہے۔ ادبی اظہار میں عام طور پر ان تینوں کا استعمال ہوتا ہے۔

قواعد کی اصطلاح میں علم نحو کے معنی ہیں جملے اور کلام کا علم۔ یعنی وہ علم جس کے تحت ان کلمات کو جو مفرد ہوتے ہیں مرکب بنایا جاتا ہے اور کلمات کی ترکیب کو جدا کیا جاتا ہے۔ اس سے کلمے کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے اور ہر لفظ کا ایک دوسرے سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح نحو میں جملوں سے بحث کی جاتی ہے۔

نحو کے مطالعے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قائل (بولنے والا) ٹھیک جملے بول سکے اور صحیح جملے لکھ سکے

ہم اردو کیسے پڑھائیں

مرکب کلمات میں ایک سے زیادہ لفظ اس طرح ملائے جاتے ہیں کہ ان کے درمیان ایک طرح کا لگاؤ، نظم اور ترتیب ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں، مرکب ناقص اور مرکب تام۔ مرکب ناقص اس مرکب کو کہتے ہیں جس کے سننے سے پوری بات سمجھ میں نہ آئے۔ مرکب تام وہ مرکب ہے جس کے سننے سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ جیسے موہن آیا، رحیم گیا وغیرہ۔

غرض زبان کی تشکیل میں محض اس بات کی اہمیت نہیں ہوتی کہ اس زبان کے ترکیبی عناصر کیا ہیں بلکہ معنوی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت پر غور کیا جاتا ہے۔

لیکن ہر زندہ زبان ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ ارتقا کے اس عمل میں زبان کو نئے تقاضوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور انھیں تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زبان کے قواعد و ضوابط میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ مختلف زبانیں بھی ایک دوسرے کے راستے میں آتی رہتی ہے۔ ان میں برابر لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اس کا اثر فوری طور پر تو نظر نہیں آتا لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں اور ان اثرات کے تحت زبان کا ڈھانچا، زبان کی ساخت اور ذخیرہ الفاظ میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔

غرض زبان کی تشکیل میں مذکورہ بالا تمام عناصر کا دخل ہوتا ہے۔ زبان کے استاد کو زبان کے ان تشکیلی عناصر سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ زبان کی تدریس کو زیادہ تخلیقی بنا سکے۔

۲- زبان کی اہمیت

زبان کی سماجی و تہذیبی اہمیت:

زبان انسان کا امتیازی وصف ہے اور اس نعمت سے حیوانات محروم ہیں۔ انسان نے ایک طویل آزمائش سے گزر کر زبان سیکھی ہے۔ یہ کلیتاً اکتسابی اور سماجی ہے یعنی ہر کس وناکس اپنے ماحول سے ہی زبان سیکھتا ہے اور سیکھ کر استعمال کرتا ہے۔ جانوروں میں کسی حد تک بعض آوازیں نکالنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان آوازوں کا مخصوص صورتوں میں ردّ عمل بھی ہوتا ہے لیکن ان میں کسی قسم کے نشوونما کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انسان ذہنی اور جسمانی طور پر اس خصوصیت کا بھی حامل ہے کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے اور اس کو فکر و اظہار کا ذریعہ بنائے۔

زبان اگر ایک طرف آلۂ نطق ہے تو دوسری جانب وسیلۂ اظہار بھی ہے۔ اس کے بغیر انسان نہ تو سماج کی تشکیل کرتا ہے اور نہ سماج میں معنویت پیدا کر سکتا ہے۔ دراصل زبان ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اظہارِ ذات کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے ذریعے اخفائے حال کا بھی کام لیتا ہے۔ زبان ہی زندگی میں زہر گھولتی ہے۔ محبت کا جام پلاتی ہے اور دردمندی اور دست گیری کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ غرض زبان اور سماج کا ایسا رشتہ ہے جس کے بغیر نہ تو زبان کی ترقی ممکن ہے اور نہ سماج کی کارکردگی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

[illegible] زبان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنی

ضروریات رفع کرتا ہے، سماج سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ اپنے دکھ درد میں دوسروں کو شریک کرتا ہے اور دوسروں کے غم بانٹتا ہے۔ گھر بازار، میلے ٹھیلے، اسکول، کالج، فیکٹری، ہر جگہ زبان کی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

زبان تہذیب کا بھی سرچشمہ ہے، اگر زبان کا وجود نہ ہوتا تو تہذیب کی نشوونما بھی ممکن نہیں ہوتی اور زبان کے بغیر بڑی حد تک تہذیب گونگی رہ جاتی۔ تہذیب کے جس پہلو پر نظر ڈالیں ہمیں زبان کی نئی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ لوک گیت، لوک کتھائیں اور شعروادب میں زبان ہی کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ آداب زندگی میں شائستگی اور شستگی زبان سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ غرض زبان نہ صرف تہذیب و تمدن کو جنم دیتی ہے بلکہ اس کے فروغ کی بھی ضامن ہوتی ہے۔ اس عمل میں ہر قدم پر زبان کا عوام سے رشتہ قائم رہتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس لمحے زبان کا عوام سے رشتہ ٹوٹا، زبان کے سوتے خشک ہو گئے اور تہذیب مرجھانے لگی۔

جن قوموں کو اپنی تہذیب سے محبت ہوتی ہے وہ اپنی زبان سے بھی محبت کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی تہذیب سے بے گانہ ہو جاتے ہیں وہ زبان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اس لیے زبان سے انسانوں کا بہت جذباتی تعلق ہوتا ہے اور اس کا اظہار جگہ جگہ لسانی گروہوں میں ہوتا رہتا ہے اور بعض دفعہ تو وہ اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس کی بنیاد پر حکومتیں بھی سرنگوں ہو جاتی ہیں۔

ذہن کے ارتقا میں زبان کی اہمیت:

ابلاغ کے علاوہ زبان کے ذریعے دو اور اہم کام انجام پاتے ہیں۔ ایک تو تفکر عمل میں آتا ہے اور دوسرے زندگی کے تجربات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تاہم ہر فرد کے لیے اس کے وظائف ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ایک ہی تہذیبی ماحول میں افراد کے لیے زبان منفرد نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔ 'لفظ' ایک علامت ہے اس کے علاحدہ سے کوئی معنی نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کی اپنی کوئی آواز ہوتی ہے بلکہ ان آوازوں اور ان کے مفاہیم پر انسانوں کے درمیان ایک طرح کا سمجھوتا ہوتا ہے اور زبان استعمال کرتے

زبان کا ایک اہم منصب ہے۔

۳۔ زبان کی تعلیم

زبان کی تعلیم کا مقصد:۔

تعلیم کے قدیم دستور کے مطابق استاد کا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے سماجی ورثے سے طالب علموں کو روشناس کرائے اس کے لیے مدرسوں میں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی وہ بڑی حد تک جانے پہچانے ہوتے تھے یعنی طالب علموں کو وہ بنیادی علم فراہم کیا جاتا تھا جو اس زمانے کی سیدھی سادی زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس علم کو حافظے میں محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مشق و تربیت کا طریقہ رائج کیا جائے چنانچہ استاد بچوں سے سبق بار بار رٹواتے تھے اور اس طرح سبق یاد کراتے تھے۔ اپنے طریقۂ تدریس میں اساتذہ مطلق العنان اور سخت گیر بھی تھے اور بڑی حد تک کم تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔

لیکن صنعتی انقلاب کی آمد سے جہاں اقتصادی نہج پر تبدیلیاں عمل میں آئیں وہاں علم و حکمت میں بھی کافی تغیرات رونما ہوئے۔ ایک صدی کے اندر علم و فن کا ذخیرہ اس تیزی سے پھیلا کہ کسی فردِ واحد کے لیے تمام علوم کا حصول ناممکن سا ہو گیا۔ سائنس علوم و سماجی علوم کے ساتھ ساتھ ملکی و غیر ملکی زبانیں، آرٹ، موسیقی اور صحت و صفائی جیسے مضامین بھی داخلِ نصاب ہو گئے۔ ان تمام باتوں کا اثر اسکول کے پروگرام پر بھی پڑا۔ تعلیم کے پرانے طریقوں کی جگہ جدید طریقے رائج ہو گئے نفسیات، عمرانیات، فلسفہ اور علم و فن کے شعبوں میں ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں آموزش کے دستور میں زبردست انقلاب آیا۔ اور تخلیقی طریقوں کی کھوج بھی ہونے لگی۔ تخلیقی تعلیم کا عظیم منصب یہ ہے کہ اختراعی قوتوں کی نشوونما ہو۔ اس تصور کے تحت آج تعلیم کے مقاصد اور تدریسی طور طریقوں کو

بھی برکھا جاتا ہے۔

زبان کی تعلیم کے سلسلے میں پہلے اساتذہ میں یہ تصور کارفرما تھا کہ زبان ایک جامد مضمون ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں یہی نہیں بلکہ مواد مضمون کو بھی جامد اور مقصود بالذات تصور کیا جاتا تھا یعنی جو کچھ پڑھایا جائے اس کا استعمال جماعت کے کمرے ہی کی حدود میں ہو۔ ان کے نزدیک صحیح زبان ایک ہوتی تھی جو ہمیشہ اسی طرح قائم رہتی تھی اور اس زبان کو جب سیکھ لیا جاتا تھا تو وہ ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے مناسب تصور کی جاتی تھی۔ اساتذہ کی بس یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس زبان کی حرمت اور روایت کو قائم رکھیں۔ آج کے معلمین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زبان بدل رہی ہے اور یہ بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ زبان بدلتی کیسے ہے۔ بڑی حد تک لوگوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ کسی ایک صورت حال میں جس طرح زبان استعمال ہوتی ہے دوسری صورت حال میں نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ مختلف سیاق و سباق میں الفاظ اپنے مفہوم بدل دیتے ہیں اور مزید یہ کہ زبان کی نوعیت عملی ہے اور اس کا خاص مقصد ابلاغ ہوتا ہے۔ ان تمام ملفوظات کے پیش نظر آج زبان کو ایک زندہ اور متحرک شے تصور کیا جاتا ہے، جو مختلف تہذیبی ماحول میں اپنے مفاہیم بدلتی رہتی ہے۔

جدید مدرسے کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو ان کی زندگی کے مسائل سے خاطر خواہ طور پر نپٹنے کے لیے تیار کیا جائے اور وسعت پذیر کلچر میں ان کی مناسب جگہ متعین کی جائے۔ تعلیم کس طرح اس فرض سے سبکدوش ہو سکتی ہے یہ مسئلہ صدیوں سے زیر بحث رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں زبان کی تعلیم سے متعلق متعدد طرز نظر اپنائے گئے ہیں اور اس کے تحت خصوصی توجہ اس بات پر دی گئی ہے کہ سماج کا تجزیہ اس ڈھنگ سے کیا جائے کہ مبلغ علم، عادتیں رویے اور مہارتیں طالب علم کی ضرورت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور طالب علم ایک بچے اور بالغ کی حیثیت سے سماج میں اپنا ایک مقام پیدا کر سکے۔ ان مقاصد کے تحت بچے جو زبان سیکھیں وہ استعمال میں آ سکے الفاظ ایسے ہوں جو تحریر میں استعمال ہو سکیں اور زبان کا استعمال اس طرح ہو کہ زیادہ سے زیادہ ابلاغ ممکن ہو سکے۔

زبان کی آموزش:۔

ہم زبان کیسے سیکھتے ہیں اس کا جواب آسان نہیں ہے اگرچہ [illegible]

بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے بغیر کسی شعوری کاوش کے اپنے گھر، خاندان اور ماحول میں زبان سیکھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغے پر مبنی تصور نہ کیا جائے کہ زبان کی بہترین آموزش مدرسے جانے سے قبل اور بغیر کسی رسمی تعلیم کے ہوتی ہے۔ ہم اپنے گھر میں بہت آسانی سے وہ زبان سیکھ جاتے ہیں جو ہمارے گھر میں بولی جاتی ہے۔ لیکن مدرسے میں چونکہ گھر کا ماحول نہیں پیدا کیا جا سکتا اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تدریس کے رموز سے بخوبی واقفیت پیدا کی جائے تاکہ زبان کی آموزش کا عمل سہل اور موثر ہو سکے۔

دراصل بچہ اس وقت زبان سیکھنا شروع کرتا ہے جب وہ اپنے گھر میں بولتے ہوئے دیکھتا اور سنتا ہے۔ ماں بچے کی مبہم آوازوں کے جواب میں مسکراتی ہے، چمکارتی اور پیار کرتی ہے۔ اس طرح ترسیل کا عمل طفولیت سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ فطری طور پر ان آوازوں کی نقل کرتا ہے جنھیں وہ اپنے گرد و پیش میں سنتا ہے۔ اس طرح وہ بامعنی آوازیں ادا کرنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ زبان کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔

زبان کی آموزش کا ایک دوسرا بھی اہم پہلو ہے۔ وہ یہ کہ بچہ اپنے گھر میں بولتے وقت نہ تو جھجک محسوس کرتا ہے اور نہ خوف۔ وہ بلا کسی پس و پیش کے اپنی خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ گھر میں لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی ضرورت کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ اپنے گھر میں بے ساختہ اپنی ضروریات کا اظہار کرتا ہے اور اپنی خواہشات کی تشفی کرتا ہے۔

اس قسم کے اسباب کی بنا پر بچہ سہولت کے ساتھ زبان سیکھتا ہے لیکن جب وہ مدرسے میں قدم رکھتا ہے تو اپنے استاد کو نہ تو والدین کی طرح شفیق پاتا ہے اور نہ اپنی خواہشات کا اظہار کر پاتا ہے۔ اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ استاد اس کی حالت میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے اس لیے زبان سیکھنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اگر بچے کو زبان سیکھنے کا مناسب ماحول فراہم کیا جائے تو یقیناً وہ بہتر طور پر زبان سیکھے گا اور جب وہ خود سیکھنے پر آمادہ ہوگا تو اس کے لیے شعوری کوشش بھی کرے گا۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اور زبان سیکھنے کے محرکات میں تنوع پیدا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بات چیت کے ذریعے کتابوں کے سہارے اور سمعی و بصری وسائل کی مدد سے اپنے گرد و پیش کی دنیا میں زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے اور فطری طور پر اس

میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس دنیا کے بارے میں جس میں وہ رہتا ہے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرے۔ زبان ہی کے توسط سے وہ مختلف مقامات کے لوگوں سے واقفیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔

بچہ جب مدرسے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے پاس زبان کا تھوڑا بہت ذخیرہ موجود ہوتا ہے لیکن اس کا لسانی تجربہ بڑی حد تک محدود ہوتا ہے۔ تاہم اس کو اس بات کا غیر شعوری طور پر تجربہ ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح آوازوں کی مدد سے لفظ بناتے ہیں۔ اور جب یہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس طرح طالب علم مفہوم سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ لسانی دنیا سے بچّے کی مطابقت بتدریج پیدا ہوتی ہے لیکن ہر بچّے میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ تاہم وہ یہ ضرور سیکھ لیتا ہے کہ الفاظ کو ادا کرسکے اور ان سے کوئی نہ کوئی مفہوم وابستہ کرسکے مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر بچّہ اپنے ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور اس کے مطابق اپنے افعال کو ڈھالتا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں کچھ نہ کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح آموزش کا عمل جاری رہتا ہے۔ دراصل آموزش کا عام طریقہ کھوج اور دریافت کا ہی ہے لیکن شروع شروع میں بچّے کی آموزش اپنے ماحول تک محدود رہتی ہے۔ اور جوں جوں وہ عمر کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے اس کی آموزش میں بھی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کی بھی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

زبان کی نشوونما ایک مسلسل عمل ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے۔ بچّہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ گھر سے غیر رسمی طور پر کچھ بولنا سیکھ چکا ہوتا ہے اور اب اس کو رسمی طور پر بولنا، سننا، پڑھنا اور لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے مدرسے میں شروع ہی سے تدریسی مشاغل میں وہ تمام مشاغل شامل کرنے چاہییں جن سے وہ اپنے گھریلو ماحول میں دوچار ہوچکا ہے۔ ابتدائی منزل پر تدریس زبان کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچّوں میں بولنے کی بنیادی مہارتیں پیدا کی جائیں اور ان مہارتوں کی توسیع کی جائے جنھیں وہ گھر پر سیکھ چکے ہیں۔

بچّوں میں زبان کی نشوونما کا جو مطالعہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچّہ جب اسکول میں قدم رکھتا ہے تو اس کے پاس اچھا خاصا الفاظ کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس میں بچّے کے ماحول کے مطابق کمی و بیشی بھی ہوسکتی ہے لیکن اوسطاً اس منزل پر بچّے کا ذخیرۂ الفاظ تقریباً ڈھائی

ہزار ہوتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ الفاظ وہ سمجھ لیتا ہے اور اس کی لسانی عادتیں بھی کسی قدر پختہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بولتا ہے اور یہ سمجھ کر بولتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو سمجھ بھی رہا ہے۔ اس کو اس سے غرض نہیں کہ وہ صحیح بول رہا ہے یا غلط، اچھا بول بول رہا ہے یا خراب۔ دراصل اس کے لیے زبان کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن مدرسے میں قدم رکھتے ہی صورتِ حال بدل جاتی ہے۔ نیا سماجی ماحول اس کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں سے بات چیت کرنے میں اس کو تکلف ہوتا ہے اور کسی حد تک وہ اپنی گھریلو زبان کو استعمال کرنے میں شرم اور جھجھک بھی محسوس کرتا ہے اور اچانک وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی بات اس کے ہم جماعت سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ میز پر چھڑی پٹک کر استاد اکثر و بیشتر بچوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا کچھ دیر کے لیے وہ بولنا موقوف کر دیتا ہے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے ہم جماعت اس کی بات سننے پر آمادہ ہیں اور بولنے لگتا ہے اور اس دوران وہ نئے الفاظ بھی سیکھ لیتا ہے۔ اس طرح اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک عبوری دور ہوتا ہے جس میں گھر کے ماحول سے نکل کر وہ مدرسے کے ماحول میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کو باقاعدہ درسی طور پر زبان سکھانے کے لیے آمادگی کا پروگرام مرتب کیا جائے۔

زبان سیکھنے کے لیے آمادگی:

زبان سیکھنے کے لیے آمادگی کا پروگرام بنانے میں بہت سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا آمادگی کا جو پروگرام مرتب کیا جائے اس میں بچے کی پختگی کی رفتار اور نشو و نما کی انفرادی حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے، ہر بچے کی سیکھنے کی رفتار مختلف ہوتی ہے اور ہر بچے کا گھریلو تجربہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد ان عوامل کو ذہن نشین کرتا ہے اور زبان سیکھنے کے کام کو اس کے تجربات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بچہ زبان سیکھنے کے لیے آمادہ ہو سکے۔ بچوں میں تحریکِ ذہنی پیدا کرانا ضروری ہے اور تحریکِ ذہنی دلچسپی پیدا کرانے میں ایک لازمی عنصر ہے۔

بچے میں فطری طور پر اظہار کی خواہش ہوتی ہے لیکن اکثر وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے تقریری اظہار پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ تقریری اظہار میں خود اعتمادی پیدا کرانے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیا جائے۔ اس کو دوسروں کی بات سننے میں بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن

بات کہنے میں زیادہ۔ اس لیے ابتدائی منزل پر اس کو زیادہ سے زیادہ اس بات کا موقع دینا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بول سکے، اپنی بات کہہ سکے اور بول کر اظہار ذات کر سکے۔

زبان سیکھنے میں درج ذیل عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

۱) بچے کی پختگی۔ (۲) آموزش کی رفتار

۳۔ دائرۂ علم

۴۔ مجموعی عملی بالیدگی

ان عوامل کے وسیلے سے بچہ اپنی زندگی سے مطابقت پیدا کرتا ہے، اپنے تجربات میں معنویت پیدا کرتا ہے اور زبان اور تجربے کے درمیان ایک گہرا رشتہ پیدا کرتا ہے لہٰذا زبان کے استاد کو ان عوامل کا بخوبی علم ہونا ضروری ہے۔

زبان کی نشوونما پر اثر انداز ہونے والے عوامل:

زبان کی نشوونما بچوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتی۔ بعض بچے کم وقت میں بہتر طور پر زبان کی مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور بعض میں لسانی نشوونما کا عمل سست اور پس ماندہ رہ جاتا ہے۔ لہٰذا پرائمری سطح کے اساتذہ کو زبان کی تعلیم کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ زبان کی نشوونما پر کون سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

زبان کی نشوونما پر اثر انداز ہونے والے عوامل درج ذیل ہیں:

۱۔ جبلی صلاحیتیں:

اس بات سے تمام ماہرین نفسیات متفق ہیں کہ افراد میں انفرادی فرق ہوتا ہے اور یہ فرق زندگی کے بیشتر معاملات پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر بچوں کے سیکھنے کی رفتار پر اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

زبان کی نشوونما کے سلسلے میں بھی انفرادی فرق کی اہمیت مسلم ہے دیکھا گیا ہے کہ وہ بچے جو چست ہوتے ہیں اور ہشاش بشاش رہتے ہیں عموماً زیادہ بولتے ہیں اور جو بچے سست اور سنجیدہ رہتے ہیں عموماً کم بولتے ہیں۔ اس انفرادی فرق کی وجہ سے بعض بچوں میں اس بات

ل زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کسی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز کر سکیں اور کسی چیز کے بارے میں بہتر طور پر خیال آرائی کر سکیں۔

۲۔ جسمانی صحت:

جسمانی صحت کا آدمی کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ مشہور قول ہے کہ تندرست جسم میں ہی تندرست دماغ پرورش پاتا ہے۔ چنانچہ زبان کی نشوونما پر بھی اس کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند بچہ بیمار بچے کے مقابلے میں جلد لسانی مہارت حاصل کر لیتا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ خراب صحت کی وجہ سے بچوں میں خود اعتمادی اور زندگی کے مشاغل میں ان کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے اس کے برعکس صحت مند بچہ ہر بات سے سروکار رکھتا ہے۔ زندگی میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور سماجی ماحول بھی اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ لہٰذا زبان کی نشوونما کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے، صحت مند بچہ مضمحل بچے کے مقابلے میں جلدی اور بہتر طور پر لسانی مہارتوں پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

۳۔ حرکی نشوونما:

ماہرین نفسیات نے اس بات کی طرف واضح اشارے کیے ہیں کہ حرکی نشوونما اور لسانی اظہار میں گہرا تعلق ہے اگر بچوں کے لیے حرکی نشوونما کے مواقع فراہم کیے جائیں تو لسانی نشوونما کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ابتدائی دور کے اساتذہ کو خصوصی طور پر مدرسے میں ایسے مشاغل کا اہتمام کرنا چاہیے جن سے حرکی نشوونما ہو سکے۔ تاکہ بچوں میں لسانی نشوونما کی ضمانت کی جا سکے۔

۴۔ جنس کا فرق:

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بچیاں بچوں سے پہلے بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ پڑھائی کا آغاز کرنے میں بھی بچیاں پہل کرتی ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بچیوں کے جملے عموماً بچوں کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ بچیوں کے جواب تفصیلی ہوتے ہیں اور بچوں کے مختصر۔ یہ بھی

[illegible] سیکھتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں تقریباً

رہا ۔

۵ تہذیب اور ماحول کا فرق:

بچوں کی لسانی نشو و نما پر تہذیب اور ماحول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بچے عام طور پر زبان نقالی کے ذریعے سیکھتے ہیں یعنی گھر میں جس طرح بڑے بولتے ہیں اسی طرح بچہ بھی بولنا سیکھتا ہے ۔ مدرسہ اور سماج بھی گفتگو سکھانے میں اثر انداز ہوتا ہے ۔ گھر تو بچے کے لیے اولین درسگاہ ہے اس لیے ماحول اور گھر کی تہذیب کا بچے کی لسانی نشو و نما پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے ۔ اگر گھر کی اقتصادی اور سماجی حالت پچھڑی ہوئی ہے تو اس گھر کی تمدنی حالت بھی پس ماندہ ہوگی اور ان تمام باتوں کا بچوں کی لسانی نشو و نما پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے ۔

ذو لسانی اثرات بھی بچوں کی لسانی نشو و نما پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے کہ بچے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی اپنے سماجی ماحول سے متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور مقامی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں ۔ اس طرح بالغوں اور بچوں کی زبان میں فرق ہوتا جاتا ہے ۔ گھر میں عام طور پر ماں باپ اپنی پہلی زبان بولتے ہیں اور بچہ مقامی زبان بولتا ہے لیکن اس کو والدین کی زبان بھی سیکھنی پڑتی ہے ۔ اس طرح بچے کے لیے ذو لسانی ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور زبان سیکھنے میں اس کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

۴۔ زبان بحیثیت علامت

پھیلے ہوئے الفاظ، وقوف اور آموزش کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ آج کل اس رشتے کو سمجھنے کی بہت کوششیں ہو رہی ہیں اور اس بات کا سُراغ لگایا جا رہا ہے کہ ان کے مابین کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جہاں تک مدرسے میں ترسیل ابلاغ کا مسئلہ ہے یہ بات سب پر واضح ہے کہ مدرسے میں ترسیلِ خیالات کا واحد ذریعہ زبان ہے اور خصوصیات کے ساتھ تحریری زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مطالعے کے ذریعے انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ بات چیت کے ذریعے انسان حاضر جواب بنتا ہے اور تحریر کے ذریعے اس میں قطعیت پیدا ہوتی ہے اور ان تینوں مراحل پر زبان ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔

ابتدائی مدرسے کی سطح پر شروع کے درجات میں زبان کام پر زور دیا جاتا ہے اور زبانی اظہار کی مشق کرائی جاتی ہے۔ لیکن بتدریج اگلے درجات میں تحریری اظہار پر زور بڑھتا جاتا ہے اور تقریری اظہار کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں۔ اظہار تقریری ہو یا تحریری، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح چھپا ہوا مواد حواس کے وسیلے سے ذہن میں منتقل ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات منتقلی کے اس میکانکی عمل کی وضاحت اور صراحت میں معروف ہیں اس سلسلے میں مختلف نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ایک تحقیقی مطالعے کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی تجربے یا کسی اطلاع یا خبر کا علامتی اظہار اگر ایک جانب انسان کی بنیادی ضرورت ہے تو دوسری طرف ایک انسانی مشغلہ بھی ہے۔ اور یہ بنیادی وصف محض انسان کو حاصل ہے کسی دوسرے ذی روح کو نہیں۔

علامتی اظہار کے ذہن میں منتقل ہونے کے پیچیدہ عمل کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو

اکٹھا کی جاتی ہے پھر ترتیب و تشکیل کے عمل سے گزرتی ہیں۔

زبان چونکہ ابلاغ کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اس لیے اس بات پر غور کرنا بہت ضروری ہے کہ مدرسے میں زبان کے وسیلے سے بچوں کو کیسے معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ یوں تو ابلاغ اور ترسیل کے اور بھی ذرائع ہیں لیکن فی الحال چونکہ زبان، بحیثیت اظہار و ابلاغ موضوعِ بحث ہے اس لیے اسی موضوع سے خصوصیت کے ساتھ بحث کی جائے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان زبان ہی کے وسیلے سے تفکر کرتا ہے، سوچتا ہے اور خیال آرائی کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ انسان بصارت، موسیقی اور شعریات کے وسیلے سے سوچتا تو شاید مدرسہ کے پروگرام میں ان کی حیثیت بھی کلیدی ہوتی لیکن صورتِ حال مختلف ہے اور پورے نظامِ درس اور نظامِ مدرسہ میں زبان ہی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لیے زبان کے علامتی اظہار پر پوری سنجیدگی سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

انسان، ادراک کی نعمت سے محروم رہ جاتا ہے اگر اس میں علامات کی ترجمانی کی صلاحیت نہ ہوتی۔ زبان کے علامتی نظام میں جو عناصر خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں وہ ہیں ترکیب نحوی اور معنیات، اس میں کبھی کبھی تصویر آفرینی کی شمولیت سے مفہوم میں اور بھی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح زبان کے علامتی اظہار کے ذریعے عملاً حواس کی ترجمانی ہوتی رہتی ہے۔ اگر اس ترجمانی کا عمل ناقص رہ جائے تو ادراک بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامتی اظہار ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے خیال، کسی شے سے اس شے کے تصور تک پہنچتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کا علامتی اظہار اپنے مفہوم کے توسط سے کسی شے کا مجرد تصور پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کے تعلیمی پروگرام میں اس پہلو پر خصوصیت کے ساتھ زور دینے کی ضرورت ہے۔ پیاجے نے جو ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ بچوں میں کسی شے کا تصور کیسے پروان چڑھتا ہے۔ برونر اور اوسلون نے مشاہداتی تجربے کے نظریے کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اشیا اور واقعات کے بارے میں اخذِ معلومات کا طریقہ انفعالی نہیں ہوتا بلکہ فعال ہوتا ہے اور مزید یہ کہ علم ہمیشہ کسی نہ کسی حرکی عمل کے توسط سے اخذ کیا جاتا ہے۔

بصری ادراک پر جو تحقیقات عمل میں آئی ہیں ان میں بھی کچھ نئی باتوں کی دریافت ہوئی ہے اور اس طریقۂ تحقیق کی رو سے بصری ادراک کو ایک ایسا عمل بتایا گیا ہے جس کے

تحت بچے کا سابقہ مختلف معروف اشیاء سے ہوتا ہے یا ان اشیا کی تصویریں انہیں دکھائی جاتی ہیں یہاں تک کہ جب اس کے سامنے نئے نمونے پیش کیے جاتے ہیں تو وہ ان کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ نہیں دیتا۔ بچہ بصری ترجیح کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔ اس کے تحت بچے کو دو اشیا یا ان کی تصویریں بیک وقت دکھائی جاتی ہیں اور وقت کی اس اعتبار سے پیمائش کی جاتی ہے کہ بچہ کتنی دیر تک ان اشیا میں سے ہر ایک پر اپنی بصری توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ اس دریافت کی روشنی میں محقق اس بات کا بھی مطالعہ کرتا ہے کہ ہر مرحلے پر بچہ صحیح معنوں میں کتنا وقوف حاصل کرتا ہے محققین نے اس بات کا بھی پتا چلایا ہے کہ جسمانی اعتبار سے ناپختہ ہونے کے باوجود وہ خارجی ہیجان کو انفعالی ڈھنگ سے نہیں قبول کرتا بلکہ فعال طریقے سے وہ خارجی ہیجان پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرنا سیکھنے لگتا ہے۔ گارڈنر اینج نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ بچے جب کسی شے کو دیکھتے ہیں تو اسی وقت یہ بات بھی ان کے بصری ادراک کی گرفت میں آجاتی ہے کہ اس شے میں کون کون سے قابلِ توجہ ہیجانات ہیں۔ ان قابلِ توجہ ہیجانات کا وہ بصری مشاہدہ کرتا ہے اور ایک سے دوسرے کی تمیز بھی کرنے لگتا ہے۔ یہی تشکیلِ تصور کی پہلی منزل ہے۔ ایک اعتبار سے اس نظریے کی رو سے پیاجے کے نظریات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ بچوں میں فنی اور حرکی سانچے موجود ہوتے ہیں اور جوں جوں خارجی ہیجانات سے ان کا سابقہ پڑتا جاتا ہے ان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حسی وحرکی سانچے علامتی طریقِ عمل کا روپ دھار لیتے ہیں جنھیں ہم زبان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

زبان کی ایک اور بھی خصوصیت ہے وہ یہ کہ معنی کے اعتبار سے زبان کا زیادہ موثر اظہار تحریری شکل میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تحریر میں اظہار بہت واضح ہوتا ہے۔ ادسکون کے مطابق زبان کا مواد معنی ہے اور معنی بڑی حد تک ذہنی خاکے پر منحصر ہوتا ہے۔ جبکہ پیاجے نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق مبلغ علم، عملی مشاغل کے توسط سے ذہنی مشاغل کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ دراصل ادسکون طریقِ وقوف اور وقوف میں امتیاز کرتا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مہارت کے رموز سے اور آخر الذکر کا تعلق تجربے سے ہے۔ غرض علامتی شکلیں چاہے تقریری زبان کی ہوں یا تحریری زبان کی، ماحول میں ایک نئے قسم کا تفاعل پیدا کرتی ہیں اور اس تفاعل کے دوران نئے قسم کی [illegible]

بچہ کوڈ کے ذریعے زبان تک رسائی حاصل کرتا ہے، اپنے نمو پذیر حواس کے ذریعے مسئلوں کا ادراک کرتا ہے اور ان کی علامتی ترجمانی کرکے زبان سیکھتا ہے۔ جوں جوں اس کی سماجی نشوونما ہوتی جاتی ہے اس میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے کہ علامتی ترجمانی کے لیے زیادہ سے زیادہ ترکیبی ساخت اور معنیات پر قدرت حاصل کرے اور مناسب الفاظ کا انتخاب کرکے اظہارِ مطلب کرے۔ چنانچہ جو کچھ بھی وہ اظہار کرتا ہے۔ وہ ترکیبی ساخت اور سماجی نشوونما کا ماحصل ہوتا ہے اور جوں جوں اس میں علامتی اظہار کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے وہ زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ علامتی اظہار کرنے پر قادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ بچہ اپنے تجربات کو تمثال کا روپ دے دیتا ہے اور نئے واقعات کے تناظر سے اپنے تجربات کا خزانہ بھرتا ہے۔ اس طرح تمثالوں کے ذریعے سے وہ اپنی فکری نشوونما کرتا ہے وہ دراصل اپنے تجربات کو منظم کرتا ہے اور نئے واقعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی تاریخی واقعے سے متعلق جب وہ بحث و مباحثہ کرتا ہے تو مباحثے کے نکات ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ یا جب وہ کسی تاریخی واقعے کو پڑھتا ہے یا کسی ڈرامے میں کسی ناٹک کا رول ادا کرتا ہے تو ان سب موقعوں پر وہ علامتی اظہار کے ذریعے ترجمانی کرتا ہے۔

اس قسم کے مشاغل کا اہتمام کرنے کیلئے مناسب موضوعات کا انتخاب ضروری ہے تاکہ ان وسیلوں سے ایسی فضا پیدا کی جا سکے

۵۔ اردو زبان کا تعارف

زبان، زبان سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مقولہ دنیا کی عام زبانوں پر صادق آتا ہے۔ اُردو
ہندستان کی ایک قدیم پراکرت شورسینی سے پیدا ہوئی۔ یہ ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جو دہلی
اور دہلی کے نواح میں پیدا ہوئی۔ یہیں پھولی پھلی۔ اور بار آور ہوئی اور ہندستان کے کونے کونے
میں پھیل گئی۔ گھر، مدرسہ، بازار، میلے ٹھیلے سے لے کر شعر و ادب کی محفلوں تک اس کی جادو بیانی
کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک کسی نہ کسی حیثیت سے
اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کا ایک گراں قدر ادبی سرمایہ ہے۔ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد
بھوپال، بمبئی اور پٹنہ اس کے خاص مراکز ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ عربی
فارسی، پرتگالی، عبرانی، انگریزی، تلگو، تامل، پنجابی، گجراتی، ملتانی اور برج کے الفاظ اس کے اندر
پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہندستان کی سرزمین کے کسی علاقے کے لیے بھی یہ زبان اجنبی نہیں
محسوس کی جاتی۔

اردو ایک پیاری زبان ہے اور اسی ملک کی زبان ہے۔ اردو زبان و ادب کی نشوونما
میں بلا کسی امتیاز مذہب و ملت تمام قوموں کا اشتراک حاصل رہا ہے۔ مختلف قوموں اور نسلوں
کے باہمی اختلاط سے اس میں رنگا رنگی اور وسعت پیدا ہوگئی ہے اور یہ زبان صحیح معنوں میں
ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ خاص طور سے اردو شاعری اپنے آغاز سے ہی ایک
مشترکہ تہذیب کی امین رہی ہے۔
... ایک گنگا جمنی تہذیب ہے۔ یہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کا سنگم ہے۔ ایرانی
... تہذیب ایک

تصوف اور بھگتی تحریک نے اس پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور مذہب و ملت کی تفریق کو مٹانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو شاعری نے خصوصیت کے ساتھ دونوں مذاہب کی روح کو سمویا ہے اور ایک سنگم کا کام انجام دیا ہے۔

اردو شاعری کے ارتقائی مراحل پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف اور بھگتی تحریک نے اردو شاعری کو کس طرح متاثر کیا تیرہویں صدی میں دہلی میں ایک مرکزی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ اسی دور میں تصوف اور بھگتی کی تحریکیں پروان چڑھیں۔ اکبراعظم کا دور صحیح معنوں میں ہندو مسلم تہذیبوں کے ملاپ کا دور تھا۔ اس کے عہد میں متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے پھولنے پھلنے کا پورا موقع ملا۔ تصوف اور بھگتی کے اس میل ملاپ سے اردو شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس میں ایک طرف اگر ترکی، فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش ہوئی تو دوسری طرف تلسی داس اور ملک محمد جائسی نے اودھی زبان میں لافانی ادب تخلیق کیا۔

بہمنی عہد میں ہندوستانی تہذیب نے دکن میں بھی فروغ حاصل کیا اور دکنی اردو کی بنیاد پڑنے لگی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں شعر و ادب کے ذریعے مشترکہ تہذیب کو بہت فروغ ہوا۔ ہندو مسلم تہذیبی اشتراک سے دکنی اردو عوام میں مقبول ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ قلی قطب شاہ کے عہد میں اس زبان نے ادبی درجہ حاصل کر لیا۔ قلی قطب شاہ اکبراعظم کا ہم عصر تھا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی زبان و ادب کا کافی عروج ہوا۔ قلی قطب شاہ کے دیوان میں ہندوستانی موسموں، تہواروں، رسم و رواج اور ہندو دیومالا کے حوالے ملتے ہیں۔ ان حوالوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اشتراک سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آرہا تھا۔

شمالی ہند کے اولین شعرا میں بھی اس تہذیبی اشتراک کے نقوش بہت واضح طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ غزل ہو یا نظم، مثنوی ہو یا قصیدہ، یہاں تک کہ مرثیوں میں بھی مشترکہ ہندوستانی تہذیب سمائی ہوئی ہے۔ مثنویوں اور قصیدوں میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستانیت کے عناصر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے اردو کسی محدود علاقے یا مخصوص خطے کی زبان نہیں بلکہ پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہندوستان کے دستور میں پندرہ قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ زبان کے استعمال، طباعت اور اشاعت کے اعتبار سے اس کا شمار ہندوستان کی اہم زبانوں میں

مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا۔

اردو زبان کہاں پیدا ہوئی اور اس کا ارتقا کیسے ہوا اس کا قطعی فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا لیکن اس کے بارے میں عام تصور یہ ضرور کار فرما ہے کہ اردو ایک کھچڑی زبان ہے جو مختلف زبانوں کی آمیزش سے پیدا ہوئی۔ خاص طور سے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی نے اردو زبان کی نشوو نما اور اس کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اس عام تصور سے ہٹ کر بعض محققین نے اردو کی ابتدا، اس کی نشوونما اور ترقی سے متعلق علاحدہ علاحدہ اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بعض نے محض تاریخی واقعات کو اپنے نظریہ کی تائید کے لیے پیش کیا اور بعض نے لسانی اور سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔

اردو زبان کے شجرۂ نسب کا اگر لسانی تاریخ کے پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا کے سب سے بڑے خاندان ہند آریائی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی پیدائش ہندستان میں ہوئی جہاں تاریخ کے مختلف موڑ پر مختلف قوموں کا میل ملاپ ہوتا رہا ہے اور اس کے سماجی اور سیاسی تقاضوں کے تحت ان کی زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے اس ملاپ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی ہے جو اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔

اُردو کے لفظی معنی ہیں لشکر اور بازار کے ۔ اور یہ ترکی زبان سے ماخوذ ہے۔ مسلمان حکمراں جب شمالی ہندستان میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ کثیر لشکر بھی تھا۔ ظاہر ہے لشکر میں کوئی نہ کوئی زبان بولی جاتی تھی اور لشکر کا سابقہ عوام سے بھی پڑتا تھا عوام سے لسانی رابطہ قائم

کرنے کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کے تحت لشکر والوں نے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ گفتگو میں استعمال کرنے شروع کر دیے اور ایک دوسرے کے درمیان افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح ایک مخلوط زبان کی داغ بیل پڑنے لگی اور رفتہ رفتہ نشو و نما کے مدارج طے کرتی ہوئی یہ ایک علاحدہ زبان کی شکل اختیار کر گئی۔

اردو کا تعلق چونکہ جدید ہند آریائی زبانوں سے ہے اس لیے اس سے متعلق کسی معقول نظریے کی تشکیل کے لیے ہند آریائی زبانوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہندستان میں عربوں کی آمد اور سنسکرت زبان کا عروج و زوال ایک طویل داستان ہے جس کو لسانی ارتقا کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ قدیم ہند آریائی جس کو ویدی یا سنسکرت دور کہا جا سکتا ہے۔
۲۔ پراکرت دور
۳۔ بھاشا کا دور

دوسرے اور تیسرے دور کے درمیانی دور کو اپ بھرنش کا عہد کہا جاتا ہے۔ سنسکرت میں چونکہ ادبیت غالب تھی اس لیے یہ زبان عوام سے کٹ گئی اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ اس دوران عوامی زبانیں پروان چڑھتی رہیں۔ مہاتما بدھ اور مہاویر سوامی نے انھیں عوامی زبانوں یعنی بولیوں میں تبلیغ کی۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہ بولیاں مختلف علاقوں میں رائج تھیں لیکن رفتہ رفتہ یہ بولیاں بھی ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی ادبی شکل اختیار کر گئیں۔ یہی بولیاں پراکرت کہلائیں۔ پالی دراصل اس کی ایک ادبی شکل ہے۔

پراکرتوں پر جب بیرونی اثرات پڑنے شروع ہوئے تو ان میں تبدیلی ہونے لگی۔ تبدیلی کے اس عمل میں دیسی پراکرتوں نے جدید پراکرتوں کی شکل اختیار کر لی۔ جدید پراکرتوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن کی تفصیلات سے قطع نظر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جدید پراکرتوں میں ایک شور سینی اپ بھرنش بھی ہے اور اردو نے اسی اپ بھرنش سے جنم لیا ہے۔ لیکن اردو کی پیدائش اور اس کی نشو و نما کے بارے میں چونکہ محققین نے علاحدہ علاحدہ نظریات پیش کیے اس لیے ان نظریات کو بھی ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اردو برج سے نکلی:

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اسی بنیاد پر بعض محققین کو اس میں پنجابی اور برج کے اثرات دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک اہم نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد کا خیال ہے کہ اردو برج سے نکلی۔ آزاد کی دلیل یہ ہے کہ مغل حکمرانوں کا مرکز آگرہ تھا اور آگرے کے نواح میں برج بھاشا بولی جاتی تھی اس لیے اردو کا حقیقی ماخذ برج بھاشا کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کی حمایت میں کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کیا گیا جس کی بنیاد کسی علمی تحقیق پر ہو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ آزاد کو لسانی تحقیق کے اس لحاظ سے مردِ میداں ہیں کہ انھوں نے 'آبِ حیات' میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے نظریے کی حمایت میں انھوں نے نہ تو کوئی شہادت پیش کی اور نہ ہی کوئی تقابلی مطالعہ کیا۔

۲۔ اردو سندھی سے نکلی:

اردو کی ابتدا سے متعلق ایک نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ اردو سندھی زبان سے نکلی اور ابتدائی اردو کے نقوش سب سے پہلے سندھ میں نظر آتے ہیں۔ اس نظریہ کو سید سلیمان ندوی نے نقوشِ سلیمانی میں پیش کیا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان پہلے پہل سندھ میں سکونت پذیر ہوئے اور تقریباً چار صدیوں تک سندھ میں اُن کا اقتدار رہا۔ اس دوران ان مقامی باشندوں سے ان کے معاشرتی تعلقات قائم ہونا عین قرینِ قیاس ہے۔ لہٰذا دونوں قوموں کے میل ملاپ سے اور مشترک استعمال زبان سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کو ہم اردو کی ابتدائی شکل کا نام دے سکتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے چونکہ تاریخی شہادتوں سے صرفِ نظر کیا اس لیے یہ نظریہ بھی مسترد کر دیا گیا۔

۳۔ اردو پنجابی سے نکلی:

اردو پنجابی سے نکلی۔ یہ نظریہ محمود شیرانی نے بڑی دھوم دھام سے پیش کیا۔ شیرانی کے خیال سے اردو کا آغاز سرزمین پنجاب سے ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو اور پنجابی میں کامل مشابہت

پائی جاتی ہے اور دونوں زبانوں کے درمیان گہری وابستگی ہے۔ شیرانی اپنی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ مسلم حکمراں چونکہ پنجاب کے راستے سے ہندستان میں داخل ہوئے اور ان میں سے بعض نے پنجاب کے علاقے میں اپنی ریاستیں بھی قائم کیں۔ خاص کر محمود غزنوی نے پنجاب میں ایک زبردست ریاست کی بنیاد ڈالی اور لاہور کو دارالخلافہ بنایا۔ لہٰذا یہ عین فطرت کے مطابق ہے کہ دونوں قوموں میں معاشرتی روابط قائم ہو گئے ہوں اور میل ملاپ کے اس مرحلے میں فارسی اور ترکی کے الفاظ پنجابی میں شامل ہو گئے ہوں۔ مسلمان حکمراں چونکہ کافی عرصے تک پنجاب کی سرزمین پر حکومت کرتے رہے اس لیے پنجاب کی بولی اس سے متاثر ہوئی ہوگی۔ ابوالفضل اور امیر خسرو نے اسی زبان کو ملتانی کا نام دیا ہے۔ پھر یہی بولی سپاہیوں اور تاجروں کے ساتھ دیگر علاقوں تک پہنچی اور نکھرتے نکھرتے اردو کی شکل اختیار کر گئی۔ شیرانی کے خیال کے مطابق یہی زبان محمد تغلق کے زمانے میں لشکر کے ہمراہ جنوبی ہندستان پہنچ گئی اور دولت آباد اس کا مرکز بنا۔ صوفیوں اور درویشوں نے اس کو تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ دکن کے شعرا نے بھی اسی زبان کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ زبان دہلی پہنچی اور اتنی ترقی یافتہ ہو گئی کہ اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

شیرانی نے سیاسی واقعات کی بنیاد پر لسانی شہادتیں پیش کی ہیں اور اُن کے نتائج اخذ کیے ہیں وہ بڑی حد تک متنازعہ فیہ ہیں۔ اس نظریہ کی تائید یا تردید میں لسانی تحقیق کی رو سے ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ تنرانی نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ قابل غور ضرور ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اردو اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے پنجابی اور ملتانی سے زیادہ قریب ہے۔ اسما و افعال کا استعمال دونوں میں یکساں ہے۔ جمع بنانے کا طریقہ بھی دونوں میں مشترک ہے اکثر الفاظ جو الف پر ختم ہوتے ہیں تانیث کی حالت میں 'ی' پر ختم ہوتے ہیں اور دونوں زبانوں میں قواعد، متروکات اور محاورات مشترک ہیں۔ شیرانی نے اردو کی ابتدا سے متعلق بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو کس علاقہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ اردو پر نواحِ دہلی کی بولیوں کے کیا اثرات پائے جاتے ہیں۔

اردو پنجابی سے نکلی، اس نظریے کا سہرا بعض محققین نے شیرانی کے بجائے محی الدین قادری

زور کے سر باندھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دراصل زور ہی نے اپنی تحقیق کے دوران اس بات کا سراغ لگایا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں اردو پر پنجابی کے اثرات کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس خیال کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی عہد قدیم سے نشاندہی نہ کی جائے جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کا مطالعہ بے سود ثابت ہوگا۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ہمسایہ بولیوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ شیرانی نے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ شیرانی کے نظریے میں دوسری خامی یہ ہے کہ جدید زبانوں کے مسائل پر بحث کرتے وقت پراکرت اور اپ بھرنش کے لسانی اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۴۔ اردو دکنی سے نکلی:

اردو کی ابتدا اور اس کے آغاز سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اردو دکنی سے نکلی۔ یہ نظریہ نصیر الدین ہاشمی نے پیش کیا ہے اور دکن میں اردو کے نام سے اپنی کتاب میں اس نظریے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہاشمی کی دلیل یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب تاجر تجارت کی غرض سے ایک بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور مالابار کے ساحلی علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ جنوبی ہند کے بعض خاندان اب بھی ایسے تاجروں سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتے ہیں اور اس بات کا کھلم کھلا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ان عرب تاجروں کی اولاد ہیں جو ساتویں صدی عیسوی میں مالابار کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ مشرقی ساحل تک پھیل گئے۔ مقامی باشندوں سے ان کا خلط ملط ہوتا گیا۔ اور باہمی رابطے کے لیے مشترک الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ زبان چونکہ سماجی رابطے میں اہم رول انجام دیتی ہے۔ اس لیے دونوں زبانوں کے اشتراک سے ایک تیسری زبان وجود میں آئی اور یہی زبان رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک ایسی زبان بن گئی جس کو اردو کی ماں کہا جا سکتا ہے۔

اس نظریے سے بعض محققین کو اتفاق نہیں۔ خاص کر محی الدین قادری زور نے اس کی تردید میں دلیل پیش کی ہے کہ عرب جب جنوبی ہندوستان میں وارد ہوئے تو اس وقت وہاں دراوڑی زبان بولی جاتی تھی اور اردو چونکہ ہند آریائی زبان سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس

نظریے کو تسلیم کرنا نہایت دشوار ہے۔ اگر اس نظریے کو تسلیم کیا جائے تو پھر ہونا یہ چاہیے کہ اردو میں دراوڑی زبان کے اثرات نظر آئے جب کہ صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دکنی اردو اور شمالی اردو سے مختلف ہے۔ اختلاف کی صورت بول چال میں خصوصیت کے ساتھ نظر آتی ہے مثلاً 'ق' کا تلفظ دکنی اردو میں 'خ' سے کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر صرفی و نحوی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے محققین کے نزدیک یہ نظریہ بھی قابلِ قبول نہیں۔

۵۔ اردو پالی سے نکلی:

کہا جاتا ہے کہ اردو کی ابتدا سے متعلق یہ نظریہ شوکت سبزواری نے پیش کیا۔ جب کہ شوکت سبزواری خود اس کی تردید کرتے ہیں۔ 'داستان زبان اردو' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں "اردو کے آغاز و ماخذ کے بارے میں آج تک جو نظریے پیش کیے گئے ہیں، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے ان پر میں نے کس قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے اپنی طرف سے میں نے کوئی نظریہ نہیں پیش کیا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اردو زبان کی اساس قرار دیتا ہوں یہ درست نہیں ہے۔ میں وہی کہتا ہوں جو جونس بلاک، گریرسن، چیٹرجی اور دوسرے ائمۂ فن نے کہا ہے۔ اور یہ کہ اردو نے جس زبان سے ارتقا پائی وہ کبھی بالائی دوابے میں بولی جاتی تھی۔"

شوکت سبزواری کو علوم مشرقیہ میں درک حاصل تھا۔ قواعد پر گہری نظر رکھتے تھے اور لسانیات کا بھی علم رکھتے تھے۔ انھیں الفاظ کی تاریخ اور علم اشتقاقیات پر بھی عبور تھا۔ اس کے وسیلے سے انھوں نے زبان کے ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سبزواری نے اپنی تحقیق سے جو نتائج اخذ کیے ہیں انھیں مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اردو نہ تو سنسکرت، پالی، شورسینی سے نکلی ہے اور نہ ہی کھڑی سے بلکہ خود کھڑی ہی اردو ہے۔ اردو کا ماخذ پراکرت ہے۔ وہ پراکرت جو دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جاتی ہے۔ شوکت سبزواری نے پالی اور اردو میں بعض لسانی مماثلتیں ضرور دریافت کی ہیں۔ اور دونوں زبانوں کے رشتے پر زور دیا ہے۔ محی الدین قادری زور نے بھی پالی اور اردو کے درمیان پائی جانے والی مشابہت کی طرف

توجہ دلائی ہے۔

مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا کے متعلق جو شواہدات پیش کیے ہیں ان میں سے چند کا ذکر یہاں برمحل ہوگا۔ موصوف کا کہنا ہے کہ دوسری بہت سی جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح اردو کی ابتدا بھی اپ بھرنش کے دھندلکے میں گم ہے اس دور کی لسانی تاریخ کا ماخذ جس قسم کا تحریری سواد ہے وہ غیر معتدبہ بھی ہے۔ قدیم اسلوب کا مطالعہ چونکہ تحریری الفاظ کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے اس لیے بولیوں کے اختلافات اور جدید ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کی صورتِ حال بڑی حد تک غیر واضح رہ جاتی ہے۔ اردو کا تحریری سرمایہ چونکہ تسلسل کے ساتھ چودھویں صدی سے عہدِ حاضر تک موجود ہے اس لیے اس کا تاریخی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اردو پر پنجابی، میواتی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں کھڑی بولی بلاشبہ اس کی اساس کا کام دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دکنی زبان دہلی کی قدیم اردو کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ اس میں چند الفاظ اردو سے مختلف ہیں اور تلفظ کا بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس پر ہریانی اور کھڑی بولی کے اثرات پائے جاتے ہیں لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ دکنی نہ تو برج بھاشا سے نکلی ہے اور نہ پنجابی سے بلکہ اس کی ابتدا نواحِ دہلی کی بولیوں سے ہوئی۔ آخر میں مسعود حسین خاں نے واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اردو میواتی، ہریانی اور کھڑی بولی کے اختلاط سے وجود میں آئی اور آج کی معیاری اردو مرادآباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے لیکن اپنے ارتقائی مدارج کے لحاظ سے یہ جمنا پار کی ہریانوی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ موصوف کی رائے میں اردو زبان کے ارتقا کی داستان عہدِ اپ بھرنش سے شروع ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی تشکیل و تعمیر میں مختلف اثرات کارفرما ہیں۔ کسی ایک خطے کا دخل نہیں۔ یہ اثرات بیرونی بھی ہیں اور اندرونی بھی۔ یعنی ایک طرف بیرونی قومیں مقامی بولیوں پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں جن کے تحت ترکی، عربی اور فارسی الفاظ اردو میں شامل ہوتے گئے اور دوسری طرف مقامی بولیاں بھی اس کو نکھارتی رہیں۔ اس طرح دہلی اور نواحِ دہلی میں ایک تیسری زبان تشکیل پاتی رہی اور اردو کا خمیر

۷۔ تدریسِ اردو کے مقاصد

ہر مضمون کو پڑھانے کے کچھ نہ کچھ مقاصد متعین ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے کوئی نہ کوئی نصاب تجویز کیا جاتا ہے اور اس نصاب کے مطابق تدریس کی جاتی ہے، تدریس کے لیے کسی موزوں طریقے کا انتخاب کیا جاتا ہے اور آخر میں تحصیل کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تعیینِ مقاصد کو تدریسی نظام میں اوّلیت حاصل ہے۔ لہٰذا تعیینِ مقاصد میں اگر کسی طرح کی کوتاہی برتی گئی تو تعلیم و تدریس کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔

تدریسِ اردو کے مقاصد بیان کرنے سے قبل یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ اردو بحیثیت مادری زبان پڑھانا مقصود ہے یا بحیثیت ایک مضمون کے۔ بحیثیت مضمون بھی اردو پڑھانے کے مقاصد کا تعیین کرنے سے قبل یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ اردو بحیثیت زبان زائد پڑھائی جا رہی ہے یا ایک بیرونی زبان کی حیثیت سے اس کی تدریس مقصود ہے۔

دیگر زبانوں کی طرح اردو پڑھانے کے مقاصد مدرسے کی ہر منزل پر مختلف ہوں گے ابتدائی، ثانوی اور اعلا ثانوی جو عام طور پر پرائمری، سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری کے نام سے مشہور ہیں، ہر منزل کے تقاضے الگ ہیں اس لیے ہر منزل کا نصاب بھی علاحدہ ہوگا۔ لیکن ان کے درمیان ایک افقی اور عمودی ربط ہونا ضروری ہے۔ افقی ربط سے مراد ہے کہ ایک ہی جماعت کے طالب علموں کو اردو پڑھاتے وقت دیگر مضامین کی تدریس سے کیسے مربوط کیا جائے اور عمودی ربط سے مراد ہے کہ کسی ایک جماعت کے طلبہ کو اردو پڑھاتے وقت اگلی جماعت کے

عام مقاصد:

عام مقاصد سے مراد وہ مقاصد ہیں جن کو مجموعی اور عمومی حیثیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ان مقاصد کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے حصول کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی مخصوص طریقہ کار ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ مقاصد بڑی حد تک مبہم ہوتے ہیں۔ اسی ابہام کی وجہ سے انہیں ٹھیک ٹھیک بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پرائمری منزل پر۔ تدریس اردو کے چار عام مقاصد بیان کیے جاتے ہیں۔

- آوازوں کے ذریعے یعنی بول کر مافی الضمیر کے اظہار کی مہارت پیدا کرنا۔
- علامتوں کے ذریعے یعنی لکھ کر مافی الضمیر کے اظہار کی مہارت پیدا کرانا۔
- سنی ہوئی بات کو سمجھ کر تفاعل کی صلاحیت پیدا کرانا۔
- لکھی ہوئی بات کو پڑھ کر تفاعل پر قدرت حاصل ہونا۔

اب ان مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر خود سے یہ سوال کیا جائے کہ بولنے سے ٹھیک ٹھیک کیا مراد ہے۔ اسی طرح اظہار مافی الضمیر سے قطعی طور پر ہم کیا سمجھتے ہیں۔ پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا اور کون سا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ ان سب سوالوں کے جواب قطعی طور پر ممکن نہیں۔ مزید برآں بولنے کی مہارت تو بچہ اسکول میں قدم رکھنے سے قبل ہی حاصل کر چکا ہوتا ہے اپنے گھر خاندان اور ماحول میں اپنی زبان سیکھ چکا ہوتا ہے اور زبان پر اس حد تک قدرت حاصل کر چکا ہوتا ہے کہ بول کر اپنی ضروریات رفع کر سکے سماجی رابطہ قائم کر سکے اور بول کر اپنے مشاہدات و تجربات کو بیان کر سکے یہ سب کچھ اس نے بیرون مدرسہ سیکھا ہے۔

مذکورہ بالا ملحوظات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام باتیں چونکہ مبہم ہیں اس لیے ان حصے تمام مقاصد کو عام مقاصد میں شمار کرایا ہوگا۔

خاص مقاصد: خاص مقاصد بڑی حد تک جزوی ہوتے ہیں۔ جزوی مقاصد سے مراد ہے کہ زبان کی تدریس سے کوئی خاص مہارت یا صلاحیت پیدا کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے تحت وقت کا تعین ہوتا ہے۔ طریقۂ کار بھی بڑی حد تک متعین ہوتا ہے۔ جیسے تدریس اردو کا خاص مقصد ہے اردو پڑھنا سکھانا اردو لکھنا سکھانا۔ ہر چند کہ یہ جزوی مقاصد ہیں، ان میں بھی کسی حد تک عام مقاصد کی شان پائی جاتی ہے۔ اس لیے متعین ہونے کے باوجود یہ غیر متعین ہوتے ہیں۔

پرائمری منزل اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس منزل پر طلبہ میں لسانی عادتیں پیدا کرائی جاتی ہیں اور اس منزل پر چونکہ خصوصیت کے ساتھ خیالات احساسات اور جذبات کی نشو و نما ہوتی ہے اس لیے تعلیم و تدریس میں اس کی خصوصی اہمیت ہے۔ مزید برآں یہ شخصیت سازی کی بھی منزل ہوتی ہے یعنی اس منزل پر شخصیت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ تعلیمی معطیوں سے پتا چلتا ہے کہ طلبہ کی بڑی تعداد دورانِ تعلیم یا اختتام پر تعلیم سے دست کش ہو جاتی ہے چنانچہ اس منزل پر وہ جو کچھ بھی حاصل کریں وہی ان کا سرمایۂ فکر و احساس ہوگا لہٰذا اس منزل پر تدریس اردو کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے جا سکتے ہیں۔

بولنا سکھانا:

بات چیت پر قدرت حاصل کرنا۔
بولتے وقت صاف، صاف اور صحت کے ساتھ بولنے کی مہارت پیدا کرنا۔
صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق کرانا۔
بولتے وقت لہجے پر قدرت حاصل کرنا۔
فطری انداز سے بولنے کی عادت ڈالنا۔

پڑھنا سکھانا:

صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا کرانا۔
اعراب و تفصیل کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا کرانا۔
صحیح ہجے پر قدرت حاصل کرانا۔

مناسب رفتار اور موزوں لب و لہجے کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا کرانا۔
بلند خوانی اور خاموش خوانی کی مہارت پیدا کرانا۔

لکھنا سکھانا:

صحیح املا کے ساتھ لکھنے کی مہارت پیدا کرانا۔
لکھتے وقت شوشے، دائرے اور مرکز کا خیال رکھنا۔
لفظ، لفظ کے درمیان فاصلے کا خیال رکھنا۔
صحت و صفائی کے ساتھ لکھنے کی مہارت پیدا کرانا۔
اوقات کا خیال رکھنا۔

سمجھنا سکھانا:

تفہیم کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ پرائمری سطح پر تفہیم کا پہلو اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا شناخت تمیز، مترادف، متضاد اور تکرار وغیرہ سے واقفیت پیدا کرانا مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا تفہیم کے لحاظ سے عام مقاصد کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے۔

لفظ اور جملے کی شناخت کر سکنا۔
صحیح ہجے کے ساتھ لفظ اور جملے کو پڑھ سکنا۔
الفاظ کو صحیح ترتیب کے ساتھ پہچان سکنا۔
سوالات کے صحیح جواب دے سکنا۔
اظہار کے لیے مناسب لفظ کا انتخاب کر سکنا۔
مناسب الفاظ اور صحیح جملوں کو استعمال کر سکنا۔
نئے الفاظ کے معنی سمجھ سکنا۔
عبارت پڑھ کر واقعات کو بیان کر سکنا۔

غرض پرائمری سطح کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی میکانکی اور نیم میکانکی مہارتوں پر قدرت حاصل کر چکے ہوں گے اور ان میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوگی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہیں صفائی کے ساتھ کر سکیں، جو کچھ لکھا جائے [illegible]

کے ساتھ لکھ سکیں اور عبارت کو پڑھ کر نفس مضمون سے واقفیت پیدا کر سکیں۔

تدریس زبان کے مقاصد کے سلسلے میں کچھ اور مباحث بھی منظر عام پر آئے ہیں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا لسانی مقاصد دراصل افادی مقاصد ہیں، بعض نے انہیں معاشی مقاصد بھی بتایا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ بولنے، پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہ صرف سماجی رابطے میں معاون ہوتی ہے بلکہ ان کے وسیلے سے انسان اپنے کاروبار کو ترقی دیتا ہے اپنے پیشے کو بہتر بناتا ہے بلکہ اپنی زندگی میں اس کے وسیلے سے معنویت پیدا کرتا ہے۔ [illegible] کے حصول سے دیگر مضامین کی آموزش میں مدد ملتی ہے۔ حصول معلومات میں سہولت پیدا ہوتی ہے اردو زبان کے وسیلے سے تصورات میں استحکام اور خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ گویا افادی نوعیت کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت علمی بھی ہے۔

اس کے برعکس زبان کی تعلیم کا جدید نظریہ یہ ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں بلکہ شخصیت سازی کا ایک اہم وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے بچے کی متوازن نشوونما میں بہت سہولت پیدا ہوتی ہے۔ گویا زبان کا ایک نشوونمائی تصور پیش کیا جاتا ہے۔

زبان کی تعلیم کے دائرے کو اور بھی وسیع تناظر میں دیکھا جا رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ زبان کے ذریعے حصول معلومات و مہارت کے ساتھ ساتھ اقدار کا بھی فروغ مقصود ہوتا ہے۔ وہ اقدار جو صحت مند ہوں، تعقل پر مبنی ہوں اور نسل و مذہب کے تعصب سے بالاتر ہوں۔ وہ اقدار جو روشن خیالی پیدا کرتی ہوں اور وسیع المشربی کا جذبہ پروان چڑھاتی ہوں۔ بالفاظ دیگر ان مباحث سے اس بات کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ تعلیم کی ہر سطح پر اور تعلیم کے ہر شعبے میں قومی اقدار کے فروغ کی گنجائش ہونی چاہیے۔ قومی اقدار میں جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم اور قومی ہم آہنگی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو زبان چونکہ قومی و جذباتی ہم آہنگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے اس لیے اردو کے نصاب میں ایسا مواد ضرور شامل کرنا چاہیے جو قومی ہم آہنگی کا احساس پیدا کرنے میں معاون ہو۔ ہر چند کہ [illegible] میں زیادہ تر لسانی مہارتوں کی نشوونما مقصود ہوتی ہے تاہم ثانوی مقصد کے طور پر انسانی اور قومی اقدار کی نشوونما پر زور دیا جا سکتا ہے۔

اردو ایک تہذیب کا بھی نام ہے اور یہ تہذیب ایک گنگا جمنی تہذیب ہے۔ اس تہذیب کے فروغ میں مختلف مذاہب اور قوموں کا اشتراک رہا ہے۔ اس خصوصیت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ہر اعتبار سے ایک مشترکہ تہذیب کی علمبردار ہے۔ اس پہلو کو بھی ثانوی مقصد کے طور پر ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

۸۔ اردو کا نصاب

نصاب کا نیا تصور:

علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئے تصورات نے جنم لیا ہے۔ ان میں سے ایک نئ
تصور نصاب کا بھی ہے۔ قدیم تصور کے تحت نصاب کے اجزا کو محض مواد مضمون تک محدود سمجھا جا
نئے رجحانات کی رو سے اس کا حلقۂ عمل زیادہ وسیع تصور کیا جاتا ہے۔ نصاب مدرسے کا ایک لا
عمل ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام تصورات اور بنیادی نکات درج کیے جاتے ہیں جن پر عمل پیرا
سے استاد بحسن و خوبی ان مقاصد کا حصول کر سکتا ہے جو اس منزل کی تعلیم کے لیے مخصوص
ہیں۔

نصاب دراصل تعلیم کی اندرونی تنظیم کا نام ہے۔ یہ استاد کے ہاتھ میں ایک ایسا آل
جس کے ذریعے وہ اپنے شاگردوں کو ڈھالتا اور اپنے نصب العین کو حاصل کرتا ہے۔

مدرسہ چونکہ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے نصاب کو بھی سماج سے ہم آہنگ ہونا چاہیے
سماج تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے نصاب کو بھی تغیر پذیر ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ترقی پذیر بھی تاکہ نو
تعلیم کی تشکیل نو میں نصاب خاطر خواہ رول ادا کر سکے۔

ان ملحوظات کے پیش نظر تدوین نصاب ایک اہم اور مشکل کام ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے
تو بے جا نہ ہوگا کہ فن تعلیم کے مشکل کاموں میں سے ایک ہے لہٰذا نصاب کی تیاری میں احتیاط
اور توجہ دونوں درکار ہیں۔ نصاب کی ترتیب اور تنظیم میں اگر ایک طرف عمرانیات، سماجیات
اور نفسیات کا علم ضروری ہے تو دوسری جانب بچے کے ماحول اور اس کی ضروریات کو بھی ملحوظ

رکھنا لازمی ہے۔

نصاب کا مقصد محض اضافۂ معلومات نہیں بلکہ بچوں کی زندگی سنوارنا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بچوں میں جو خداداد صلاحیتیں موجود ہیں ان کی بدرجۂ اتم نشو و نما ہو اور ان میں ایک متمدن زندگی کے فرائض کا شعور پیدا ہو جائے۔

ایک اچھا نصاب، استاد کے لیے ایک ایسے آلے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے وہ تعلیم کے علاوہ بچوں کا اخلاق بھی سنوارتا ہے اور اس کی متوازن نشو و نما کے لیے ایک خوشگوار ماحول بھی پیدا کرتا ہے لہٰذا کامیاب تدریس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر سطح پر مضامین کی تدریس کا ایک عمدہ نصاب تیار کیا جائے۔

ابتدائی سطح پر عام طور سے پانچ سال کی عمر میں جو بچے داخل ہوتے ہیں ان میں کافی انفرادی فرق پایا جاتا ہے۔ ان کی لسانی صلاحیتوں اور زبان سیکھنے کی جانب ان کے رویوں میں بھی کافی اختلاف نظر آتا ہے۔ اگر ان پہلوؤں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان بچوں کی صلاحیتوں مہارتوں اور دلچسپیوں میں بہت دلچسپ تنوع نظر آئے گا۔ ممکن ہے کوئی بچہ وافر ذخیرۂ الفاظ پر قدرت رکھتا ہو لیکن بعض اصوات کی ادائیگی میں وہ پختہ نہ ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ کہانی سنانے کی بخوبی صلاحیت رکھتا ہو لیکن زبان کے استعمال میں لاپرواہ ہو۔ زبان کی بنیادی مہارتیں اور استعمال کے اصول سکھانے کی ذمے داری بڑی حد تک ابتدائی درجات کے اساتذہ پر ہے۔ لہٰذا یہ بھی ضروری ہے کہ ابتدائی منزل پر تدریسِ اردو کے مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو حصولِ مقاصد سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو۔

زبان کے ایک عمدہ نصاب کا تقاضا یہ ہے کہ مناسب طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے اور ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو سکے اور سہولت کے ساتھ مقاصد کا حصول ہو سکے جس استاد کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم کے رجحانات اور طبعی تقاضے کیا ہیں وہ طلبہ کو پڑھاتے وقت ان تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس میں خصوصیت کے ساتھ یہ پہلو ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ مادری زبان صرف مدرسے کا مضمون نہیں بلکہ پورے مدرسے کی زندگی کی ایک شرط ہے۔ مدرسے کی تمام تر زندگی میں چہا ہمی اور گہما گہمی مادری زبان ہی کے طفیل نظر آتی ہے۔ ایک جانب مادری زبان شخصیت سازی کا ایک ذریعہ ہے تو دوسری جانب افہام و تفہیم اور

تدریس و تعلیم کا بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔ مادری زبان کے ذریعے ایک طرف بچہ خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے تو دوسری طرف گرد و پیش کی زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہوتا ہے، تہذیبی زندگی میں بھی رنگ بھرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ مادری زبان ذہنی اور تہذیبی زندگی کا سنگ بنیاد ہے۔

ابتدائی منزل کی تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ لسانی اظہار پر قدرت حاصل کرلے۔ اس لیے اس منزل پر ہر نصاب مرتب کرتے وقت لسانی مہارتوں کی تعلیم اس طرح کرنی چاہیے کہ بچہ زیادہ سہولت کے ساتھ مطلوبہ لسانی عادتیں پیدا کر سکے۔

لسانی مہارتیں اپنی نوعیت اور خصوصیت کے اعتبار سے دو طرح کی ہوتی ہیں، میکانکی اور نیم میکانکی۔ میکانکی مہارتوں میں صحیح تلفظ، ادائیگی، لب و لہجے کی شستگی اور خوش خطی وغیرہ شامل ہیں۔ ابتدائی منزل پر زبان کی تعلیم کے دوران انھیں مہارتوں کا زیادہ استعمال بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح نیم میکانکی مہارتوں میں بات چیت، گفتگو، پڑھنا اور لکھنا شامل ہیں لہٰذا ابتدائی منزل پر ان مہارتوں کی نشوونما اور مناسب لسانی عادتیں پیدا کرانے پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔

ایک عمدہ نصاب میں عمودی اور اُفقی ربط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے لہٰذا درجہ وار نصاب مرتب کرتے وقت درجہ وار نصاب کے مابین ایک منطقی ربط ہونا چاہیے اسی طرح مدرسے اور گرد و پیش کی زندگی سے بھی موضوعات کا رشتہ پیدا کرانا ضروری ہے۔

مادری زبان کی حیثیت سے اردو کو درجہ وار نصاب مرتب کرتے وقت لسانی مہارتوں اور صلاحیتوں کی تقسیم حسب ذیل طریقے سے کی جا سکتی ہے۔

جماعت اوّل:

بولنا:

پہلی جماعت میں جب بچے داخلہ ہوتے ہیں تو ان میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ بول کر اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکیں لہٰذا اب اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ سیکھے ہوئے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر سکیں۔ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر گرد و پیش کے

حالات اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں۔ کہانیاں سُن کر اپنے الفاظ میں سُنا سکیں اور ہلکی پھلکی نظمیں صحیح لب ولہجے کے ساتھ پڑھ کر سنا سکیں۔ اپنے ماحول کی جاندار اور بے جان اشیاء کی پہچان کر سکیں اور اُن کے ناموں کے ساتھ ان کی شناخت کر سکیں۔ خاص طور سے جانوروں، پرندوں اور پھول پودوں کے نام سے ان کی شناخت کر سکیں۔

پہلی جماعت میں بولنے کی نشوونما کرانے کے لیے گھر، مدرسے اور گرد و پیش سے متعلق بات چیت کی جا سکتی ہے، کہانیاں سنائی جا سکتی ہیں، کہانیاں سنی بھی جا سکتی ہیں۔ اور ہلکی پھلکی نظمیں یاد کرائی جا سکتی ہیں، تصویروں کے ذریعے کہانی کہلوائی جا سکتی ہے۔ مختلف کھیلوں اور سیر سپاٹوں سے متعلق بات چیت ہو سکتی ہے۔

پڑھنا:

پہلی جماعت میں چونکہ پڑھنے اور لکھنے کا آغاز کرایا جاتا ہے اس لیے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ بچے حروف تہجی اور اعراب کو صحیح طریقے سے پڑھ سکیں۔ حروف کو ملا کر لفظ اور لفظوں سے جملے بنا کر پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ بول چال میں آئے الفاظ اور رٹے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کر سکیں اور آسان عبارت کو روانی اور تاثر کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

لکھنا:

عام طور پر یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ پڑھنا اور لکھنا ساتھ ساتھ شروع کرانا چاہیے لہٰذا پہلی جماعت میں لکھائی کی بنیادی مہارتوں پر توجہ دینا چاہیے۔ یعنی حروف کو ملا کر لکھنے کی مشق کرائی جائے۔ اردو میں عام طور پر حروف کی تین صورتیں شکلیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی، درمیانی اور انتہائی۔ ان میں بھی کبھی کبھی یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر 'بکری' میں 'ب' کی شکل 'ب' سے 'ب' اور 'ک'، کی 'ک' لیکن 'کام' میں 'ک' کی شکل 'کا' ہو جاتی ہے اسی طرح بعض حروف ابتدا میں اپنی اصلی صورت کو قائم رکھتے ہیں اور بعض ہر حالت میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ جیسے لفظ 'اردو' کو لیجیے اس لفظ میں حروف کی شکلیں نہیں بدلتیں بلکہ سب اپنی شکل میں موجود ہیں۔ اسی طرح 'زرد' 'درد' وغیرہ بہت سے الفاظ گنائے جا سکتے ہیں۔

حروف کو ملا کر لکھنے کی صحیح مہارت پیدا کرانے کے بعد لکھائی کا کام بڑی حد تک سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بچوں میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرانی چاہیے کہ وہ الفاظ اور جملوں کو صحیح املا کے ساتھ لکھ سکیں۔ اس منزل پر منفرد الفاظ اور جملے لکھوانے چاہیے۔

لکھنے کی مہارتیں پیدا کرانے کے لیے نقل نویسی سے آغاز کرانا چاہیے اور طلبہ میں اس بات کی عادت پیدا کرانی چاہیے کہ وہ سیدھے بیٹھ کر لکھیں، تختی، سلیٹ یا کاپی سیدھی رکھیں، لکھتے وقت الفاظ کے درمیان فاصلے کا خیال رکھیں اور صاف صاف لکھنے کی کوشش کریں۔

جماعت دوم:

پہلی جماعت میں جن مہارتوں کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے دوسری جماعت میں ان کی مشق کرائی جاتی ہے اور بعض نئی مہارتیں پیدا کرائی جاتی ہیں اس طرح زبان کی بنیادی عادتوں اور رجحانات میں ترقی و توسیع کرائی جاتی ہے۔ لہٰذا جماعت دوم کے نصاب میں ان ملحوظات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

پڑھنا:

اس منزل پر بآواز بلند پڑھنے پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے لہٰذا شاگردوں میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرانی چاہیے کہ وہ اپنی درسی کتاب سے صحت اور روانی کے ساتھ بآواز بلند عبارت پڑھ سکیں، پڑھتے وقت الفاظ کا صحیح اور واضح تلفظ ادا کر سکیں اور پورا جملہ ایک سانس میں پڑھ سکیں۔ پڑھتے وقت صحت کی بھی کوشش کرنی چاہیے کہ سطر پر انگلی رکھے بغیر پڑھیں۔ اسی طرح نظم پڑھ کر سنا سکیں اور پڑھتے وقت مصرعوں کی موزونیت اور الفاظ کے زیر و بم کا خیال رکھ سکیں۔

پڑھائی کے پروگرام کے ساتھ بعض عادتوں میں پختگی پیدا کرانے کی جانب بھی توجہ دینا ضروری ہے۔ مثلاً پڑھتے وقت ٹھیک طرح سے بیٹھ کر پڑھیں یا ٹھیک کھڑے ہو کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ اپنی درسی کتاب کو صفائی کے ساتھ رکھ سکیں۔

مندرجہ بالا صلاحیتوں اور مہارتوں کے حصول کے لیے درسی کتاب کو ذریعہ بنایا جائے

کے واقعات بیان کر سکیں۔ اعلان، اشتہار اور اطلاعات پڑھ کر سنانے کی اہلیت پیدا کر سکیں۔ کسی بچے کی کوئی چیز اگر گم ہو جائے تو وہ اپنی جماعت کے سامنے کھڑے ہو کر مختصر طور پر اس کی تفصیل بیان کر سکے اور اعلان سے یہ بتا سکے کہ کون سی چیز کھوئی ہے اور کس جگہ کھوئی ہے۔

اوپر جن مشاغل کا ذکر کیا گیا ہے، انھیں سے متعلق لکھائی کا کام کرایا جا سکتا ہے۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے جملوں کو تختۂ سیاہ پر لکھ کر ان کی نقل لکھائی جا سکتی ہے۔ بچوں نے جو کام کیے ہیں یا ابھی حال میں جن چیزوں کو دیکھا ہے ان سے متعلق چھوٹے چھوٹے جملے لکھوائے جا سکتے ہیں۔

تحریری مشاغل سے متعلق بچوں میں اس بات کی عادت پیدا کرائی جا سکتی ہے کہ وہ لکھتے وقت شوشوں اور دائروں کا خیال رکھیں، لفظوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھیں، صحتِ املا کا خیال رکھیں۔ قلم ٹھیک طرح سے پکڑیں اور ٹھیک طرح سے چلائیں، سیدھے بیٹھ کر لکھیں، کاپیاں بھی سیدھی رکھیں اور حاشیہ چھوڑ کر لکھنے کی عادت ڈالیں۔

جماعت سوم:

سوم جماعت ابتدائی دو جماعتوں اور بعد کی دو جماعتوں کے بیچ درمیانی کڑی ہے۔ اس لیے اس جماعت میں دوم جماعت کے پورے نصاب کا اعادہ کرایا جائے گا اور بعض نئی مہارتیں بھی پیدا کرائی جائیں گی۔ مثلاً دوم جماعت میں بلند خوانی کی مہارت پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ یہاں اس میں مزید پختگی پیدا کرائی جائے گی اور پڑھائی کی ایک نئی مہارت پیدا کی جائے گی۔ اس کو مطالعہ زیرِ لب کہہ سکتے ہیں۔ یہ بلند خوانی اور خاموش خوانی کی درمیانی کڑی ہے۔ خاموش مطالعہ کا کام باقاعدہ طور پر چوتھی جماعت سے شروع کرانا مناسب ہوگا۔

مطالعہ زیرِ لب یعنی منہ ہی منہ میں پڑھنے کی کیفیت ہونی چاہیے۔ مطلب یہ کہ ہونٹ ہلیں لیکن آواز دوسروں کو نہ سنائی دے۔ مطالعہ زیرِ لب کے دوران صحتِ تلفظ، روانی اور تاثر کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ الفاظ اور جملوں کے مفہوم پر بھی توجہ ہونی چاہیے۔ یعنی بچہ توتے کی طرح محض رٹائی سے کام نہ لے بلکہ جملے یا عبارت کے پوشیدہ مفہوم تک بھی رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس منزل پر طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اچھا خاصا اضافہ ہو سکتا

ہے اور طلبہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرائی جا سکتی ہے کہ وہ یاد کیے ہوئے اور نئے الفاظ کو واضح طریقے سے پڑھ سکیں اور پڑھتے وقت صحت تلفظ، روانی اور تاثر کا خیال رکھیں۔ مزید یہ کہ پڑھتے وقت اوقاف کا خیال رکھیں، اوقاف کی محض شناخت کرنا کافی نہیں بلکہ پڑھنے کے ڈھنگ اور مفہوم پر اوقاف کا جو اثر پڑتا ہے اس کا شعور بھی پیدا کر سکیں۔

اس منزل پر درسی کتاب کے علاوہ قصے کہانی کی کتابیں بھی طور پر پڑھنے کو دی جائیں تو مناسب ہوگا۔ غیر درسی مطالعے کے ذریعے تیزی سے پڑھنے کی عادت پیدا ہوگی اور طویل فقروں کے مفہوم کو بیک نظر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور اس کی مشق کے بھی مواقع حاصل ہوں گے۔

بولنا اور لکھنا:

دوم جماعت کے نصاب کا اعادہ کرایا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کی لسانی عادتوں اور مہارتوں کی توسیع بھی کرائی جائے گی اس منزل پر بولنے کی مشق کراتے وقت گفتگو کے نقائص کی بھی شناخت کی جائے گی اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب اور موزوں مشقیں فراہم کی جائیں گی تاکہ طالب علم صرف بے جھجک اپنے خیالات کا صاف طور پر اظہار کر سکیں بلکہ اپنی گفتگو کو شستہ بنانے کی بھی کوششیں کریں۔

تحریری نشوونما کا دائرۂ عمل اس منزل پر کس قدر وسیع ہو جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ جماعت دوم کے تحریری کام کی مشق کے علاوہ طلبہ میں اس طرح کی صلاحیت پیدا کرائی جاسکے کہ وہ خوش خط اور مناسب رفتار سے نقل اور املا لکھ سکیں۔ اس منزل پر خط لکھنے کی بھی شدبد پیدا کی جا سکتی ہے۔ خط کے مختلف حصّوں سے انھیں واقف کرایا جا سکتا ہے اور بچّوں میں اس بات کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک آسان سا خط نقل کر سکیں اور خط کے الفاظِ خطاب، اصل مضمون اور راقم کا نام اور اپنا نام صحیح اور صاف لکھ سکیں۔

مندرجہ بالا مہارتوں کے حصول کے ساتھ ساتھ طلبہ میں تحریر سے متعلق درج ذیل عام عادتیں اور رجحانات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ لکھتے وقت جملے کے اختتام پر (۔) اور سوالیہ جملوں کے آخر میں سوالیہ نشان (؟) لگانا سیکھ جائیں۔ اسی طرح تاریخ لکھنے کے بعد مثلاً

۱۲ ، ۲۲ ، اور ۲۵ ، اپریل کے بعد سنہ ۸۵ء لکھنا یا جو بھی سنہ آئے لکھنا سیکھ جائیں۔

عام طور پر بچوں میں حاشیہ چھوڑ کر لکھنے کی عادت نہیں پیدا ہوتی لہٰذا حاشیے چھوڑ کر لکھوانے سے اس کی عادت پیدا ہو سکتی ہے۔

جماعت چہارم:

پڑھنا:

درجہ سوم کی پڑھائی کے کام کی مشق کے دوران اوقاف کی اہمیت، تفہیم کے لیے پورے فقرے پر نظر کا دوڑنا اور روانی کے ساتھ پڑھنے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جائے گا۔ درجہ سوم میں بآواز بلند مطالعے کے ساتھ ساتھ مطالعۂ زیر لب تجویز کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ بآواز بلند مطالعے اور خاموش مطالعے کی درمیانی کڑی ہے۔ لہٰذا اس منزل پر خاموش مطالعے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جائے گا۔ خاموش مطالعے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کے مطالعے کی رفتار میں اضافہ ہو اور تفہیم کا عمل سہل ہو جائے۔ پڑھنے کی رفتار اور تفہیم میں گہرا رشتہ ہے۔ لہٰذا اس منزل پر بآواز بلند مطالعے کے ساتھ ساتھ طلبہ میں خاموش مطالعے کی عادت پیدا کی جائے گی تاکہ طلبہ تیزی کے ساتھ پڑھنا سیکھ جائیں، پڑھی ہوئی چیزوں کو یاد رکھ سکیں اور تفہیم کے سوالات کے جواب دے سکیں۔

پڑھائی کے ذریعے اس منزل پر مندرجہ ذیل صلاحیتیں پیدا کی جا سکتی ہیں:

طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کرائی جائے گی، وضاحت اور صراحت کے ساتھ اور بآواز بلند پڑھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے گی۔ بآواز بلند پڑھتے وقت اس بات پر بھی زور دیا جائے گا کہ طربیہ اور المیہ تحریروں سے اثر لے سکیں اور بآواز پڑھتے وقت ان اثرات کو دوسروں تک منتقل کر سکیں اسی طرح نظمیں پڑھتے وقت اوزان بحر اور ترنم کا خیال رکھیں۔ نظم کو نظم کی طرح پڑھنے پر توجہ دی جائے گی۔ نثری عبارت پڑھتے وقت عبارت کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے گا۔

درجہ چہارم تک پہنچتے پہنچتے طلبہ میں پڑھائی کی ایسی مہارت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آزادانہ مطالعۂ کتب کر سکیں اور اپنی پسند کی کتابوں کا انتخاب کر سکیں۔ لہٰذا ان کے لیے وسیع پیمانہ پر غیر درسی مطالعے کی تمام سہولتیں فراہم کرنا ضروری ہے۔ مدرسے کا کتب خانہ اس سلسلے میں بہت

اہم خدمت انجام دے سکتا ہے۔ استاد جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں غیر درسی مطالعہ سے اس طرح دلچسپی پیدا کرا دیں کہ طالب علم اپنی پسند کی کتابیں کتب خانے سے نکال کر پڑھنے کی عادت ڈال لیں۔

عام عادتوں اور رجحانات کی توسیع کے لیے پڑھائی کے دوران بہت سے مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا طلبہ میں یہ عادت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ درسی کتاب کے علاوہ غیر درسی کتاب بھی سہولت کے ساتھ پڑھ کر مطلب اخذ کر سکیں۔ گویا کہ مطالعہ سے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کر سکیں۔ فہرست مضامین اور انڈکس کے ذریعے اپنی ضرورت کے مطابق کتابوں سے مواد فراہم کر سکیں۔

بولنا اور لکھنا:

اس منزل پر پہنچ کر طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ کسی بات کو توجہ اور غور سے سن سکے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کہانیاں، نظمیں اور دیگر پروگرام سن کر لطف اندوز ہو سکے اور سنی ہوئی باتوں سے متعلق سوال و جواب کر سکے۔

اسی طرح بولنے کی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے بھی یہ منزل بہت اہم ہے اس لیے کہ اس منزل تک پہنچتے پہنچتے طالب علم میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کو صفائی کے ساتھ ترتیب کے ساتھ اور مربوط طریقے پر بیان کر سکے، مدرسے کے تمام اجتماعی پروگرام میں عملی طور پر حصہ لے سکے اور جلسوں میں شریک ہو کر کہانیاں، قصے اور نظمیں سنا سکے اور اپنی پسند کی نظمیں یاد کر سکے۔

تحریری نشوونما کے لیے بھی یہ منزل بہت اہم ہے اس لیے کہ اس منزل پر طالب علم کو تحریر کی بنیادی مہارتوں پر قدرت حاصل ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا جماعت سوم کے تحریری مشاغل کا اعادہ کرتے وقت تحریری مہارتوں میں زیادہ پختگی پیدا کرائی جائے گی۔

نقل نویسی کے کام میں خوش نویسی کے پہلو پر زور دیا جائے گا تاکہ طالب علم کو خوش خطی کی طرف مائل کیا جا سکے۔

اسی طرح درسی کتاب سے املا نویسی کا کام جاری رہے گا۔ املا نویسی کے دوران سماعت، یادداشت اور رفتار کے ساتھ صفائی اور صحت کے ساتھ لکھنے کی مشق کرائی جائے گی۔ سکون، اوقاف کا بھی خیال رکھا جائے گا۔

اس جماعت میں انشا کے کام میں کافی توسیع کی گنجائش ہوتی ہے اور صحیح معنوں میں اسی جماعت سے تحریری کام میں انشا کا رنگ آجانا چاہیے۔ اس منزل پر پہنچنے کو خطوط نویسی، درخواست نویسی اور ہلکے پھلکے بیانیہ مضامین لکھوانے کی مشق کرائی جانی چاہیے۔

خطوط نویسی کے دوران طالب علم میں اس بات کی مہارت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ خطوط کے مختلف حصوں کی مناسب تقسیم کر سکے، القاب سے متعلق فرق مراتب کو پہچان سکے، نجی اور دوستانہ خط لکھ سکے۔ نجی خط میں مقررہ بندھے ٹکے رسمی فقروں سے احتراز کرے نیز تمہید (ابتدا)، نفس مضمون اور اختتام کا خیال رکھے۔ تاریخ اور سنہ عیسوی صاف صاف مناسب جگہ پر مناسب فصل کے ساتھ لکھ سکے اور سر خط میں صحیح پتا لکھ سکے۔

اسی طرح اطلاعات، اعلانات اور اشتہارات وغیرہ لکھنے کی بھی مشق اور مختلف قسم کے نقشوں کی خانہ پری کرائی جا سکتی ہے جیسے اپنے متعلق معلومات مثلاً قد، وزن، پیدائش کی تاریخ اور مدرسے میں داخلے کی تاریخ اور اپنے مدرسے کے کتب خانے سے کتاب نکلوانے کے لیے مصنف کا نام اور ناشر کا صحیح نام لکھ سکنا وغیرہ۔

قواعد سے تحریری کام کو ربط دے کر اسم کی شناخت اور اس کی اقسام، ضمیر و صفت کی شناخت، فعلیہ جملوں کی شناخت اور فاعل اور مفعول کی شناخت بھی کرائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مترادف اور متضاد الفاظ بھی لکھوائے جا سکتے ہیں۔ اس منزل کے اختتام پر طالب علموں میں تحریری کام کرتے وقت یہ عادت پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ جملے کے اختتام پر (۔) اور واوین لگانے کی عادت پیدا کر سکیں۔ اسی طرح ان میں اس بات کی عادت پیدا ہو جانی چاہیے کہ وہ سرخی، ذیلی سرخی، پیرا بندی وغیرہ کی بھی پابندی سیکھ جائیں۔

درجۂ پنجم:

پڑھنا:

درجۂ چہارم تک کی پڑھائی کی مہارتوں کا اعادہ کرایا جائے گا اور مندرجہ ذیل مہارتوں کو بڑھایا جائے گا۔

طلبہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ الفاظ اور محاوروں کا مطلب اُن کے استعمال

کے مطابق سمجھ سکیں۔ زیرِ مطالعہ مواد سے مرکزی خیال اخذ کر سکیں اور بچوں کے ادب سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن سے بھی سرسری واقفیت حاصل کر سکیں۔ جیسے کہانی، ڈراما اور مضمون وغیرہ۔

بولنا اور لکھنا:

درجہ چہارم کی تقریری مہارتوں کا اعادہ کرایا جائے گا۔ طلبہ کی تقریری مہارتوں میں توسیع پیدا کرائی جائے گی۔ اس منزل پر طلبہ میں خاص طور سے صلاحیت پیدا کی جائے گی کہ وہ کسی اہم واقعہ کو پُر اثر انداز میں بیان کر سکیں، اپنے مذاق کے مطابق نظموں کا انتخاب کر سکیں اور ان کو اچھے انداز سے پڑھ کر سنا سکیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے نظم خوانی کے مقابلے، کہانی سنانے کے مقابلے، بیت بازی اور تقریری مقابلے کرائے جا سکتے ہیں۔

تحریری نشوونما کے لیے مندرجہ ذیل مشاغل اپنائے جا سکتے ہیں:

مختصر اور نجی کاروباری خط لکھوائے جا سکتے ہیں۔ کسی کھوئی ہوئی چیز کا اعلان یا جلسے کی رپورٹ بھی لکھوائی جا سکتی ہے اور بیانیہ مضمون بھی لکھوائے جا سکتے ہیں۔

اس منزل پر تحریری کام میں طلبہ کی تخلیقی صلاحیت پر زور دینا چاہیے اور ایسے موضوعات پر تحریری اظہار کرانا چاہیے جن میں ندرتِ بیان کا امکان ہو۔

قواعد کے کام میں درجہ چہارم کے کام کا اعادہ کرایا جائے گا اور عملی قواعد کے پیشِ نظر پڑھے ہوئے اسباق سے مندرجہ ذیل باتیں لکھوائی جائیں گی۔

اسم کی اقسام، جنس اور صیغہ

ضمیر کی اقسام، صفت اور موصوف

فعل کی حالتیں (حال، ماضی، مستقبل)

.. کے [illegible] اعراب پر بھی توجہ دی جائے گی۔

گھر ہو یا مدرسہ ہر جگہ بچہ کو سنتا رہتا ہے اور سننے کا یہ عمل شب و روز جاری رہتا ہے چونکہ سننے سے بولنے اور سمجھنے کا گہرا تعلق ہے اس لیے زبان کی تعلیم میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا مدرسے کے پروگرام میں سننے کی باقاعدہ تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سننے کا عمل ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے بولنے والے کے احساسات، جذبات اور خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔ عام زندگی میں سننے کا عمل ایک انفعالی کیفیت کا نام ہے لیکن اگر کسی خاص مقصد کے پیش نظر یک سوئی کے ساتھ سنا جائے تو یہ ایک فعال عمل ہو سکتا ہے۔

مثلاً کسی خاص مقصد کے پیش نظر مواد فراہم کرنے کے لیے ریڈیو سنا جا سکتا ہے یا ٹیلی ویژن کے ذریعے مطلوبہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھار محض لطف اٹھانے کے لیے سماعت کا پروگرام بنایا جا سکتا ہے۔ بچوں کو ریڈیو سے کوئی کہانی سنائی جا سکتی ہے یا دادی یا نانی اماں سے کوئی کہانی سنی جا سکتی ہے۔ بچے عام طور پر یہ کہانیاں شوق سے سنتے ہیں۔

غرض سماعت ایک ایسا عمل ہے جس سے ہر بچے کو ہر وقت سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہر اس جگہ اس کا عمل دخل ہوتا ہے جہاں لسانی تجربہ شروع ہوتا ہے۔ مدرسے تک رسائی حاصل ہونے سے قبل ہی بچہ کسی قدر سماعت کی تربیت حاصل کر لیتا ہے۔ سماعت سے متعلق بچے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا وقفۂ سماعت بہت تھوڑا ہوتا ہے وہ بہت دیر تک کسی بات کو سننے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بچوں سے جب کوئی بات کہی جائے یا انھیں کلاس میں کچھ ہدایتیں دی جائیں تو یہ اطمینان کر لیا جائے کہ کلاس میں مکمل خاموشی ہے۔

ہدایت دیتے وقت یا بات چیت کرتے وقت استاد یا استانی کو چاہیے کہ صاف اور موثر ڈھنگ سے گفتگو کرے، تھوڑا ٹھہر ٹھہر کر بولے اور لب و لہجے کا خاص طور سے خیال رکھے تاکہ بچے سماعت کی جانب راغب ہوں اور بہتر سماعت کی عادت پیدا کر سکیں۔

سماعت کی بہتر تربیت کے لیے بعض دلچسپ کھیل کھلائے جا سکتے ہیں اور بچوں کی عمر اور ان کی دلچسپیوں کے لحاظ سے ایسے مشاغل شروع کرائے جا سکتے ہیں جن میں بچے خود شرکت کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے مشاغل تجویز کیے جا سکتے ہیں۔

مختلف نوعیت کی آوازیں سنانا:

بچوں میں سماعی تربیت کے لیے مختلف نوعیت کی آوازیں سنائی جا سکتی ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ کھٹکھٹانے کی آواز:

گرد و پیش کی مختلف اشیاء پر کھٹکھٹانے کی آواز سنائی جا سکتی ہے اور اس کی شناخت کرائی جا سکتی ہے۔ لکڑی پر کھٹکھٹانے کی آواز، فرش پر کھٹکھٹانے کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح ٹھوس سطح اور کھوکھلی سطح پر کھٹکھٹانے کی آواز کی شناخت کرائی جا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ لوہے شیشے اور پلاسٹک کے سامان اس مقصد کے لیے کلاس میں فراہم کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ مختصر اور طویل آوازیں:

پانی کا نل کھولنے پر جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کی شناخت کرائی جا سکتی ہے اسی طرح گھڑی کی ٹک ٹک سنا کر آوازوں کی شناخت کرائی جا سکتی ہے۔

۳۔ بولنے کی آوازیں:

بچے مختلف جانوروں کے نقلی چہرے اپنے منہ پر لگا کر بولیں۔ اس طرح جانوروں کی بولیوں کی شناخت کرانے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔

۴۔ اڑنے اور دوڑنے کی آوازیں:

ہوائی جہاز کی آواز، اڑتی چڑیوں کی آواز، دوڑتے ہوئے کتے کی آواز، اسکوٹر، موٹر سائیکل اور موٹر کی آوازوں میں امتیاز کرایا جا سکتا ہے۔

گفتگو سیکھنے کا عمل اس بات پر منحصر ہے کہ بچّہ کس حد تک سماعتی تربیت حاصل کر چکا ہے۔ وہ خود اپنی آواز سنتا ہے اور گھر کے لوگوں کی بھی آوازیں سنتا ہے۔ وہ بازار اور گلی کوچوں میں مختلف قسم کی آوازیں سنتا رہتا ہے۔ وہ بول کر اپنی مختلف حاجتوں کو پورا کرتا ہے اور اپنی خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح بولنے اور سننے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور بچّہ اسی عمل کے دوران بہتر بولنے کی تربیت حاصل کرتا رہتا ہے۔

بچّہ جب گفتگو کا آغاز کرتا ہے تو اس کے سامنے وہ مقاصد نہیں ہوتے جو بالغوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ مدرسے میں داخل ہونے سے قبل وہ بولنے کی ایسی مہارت پیدا کر لیتا ہے کہ اپنی بات کو صفائی کے ساتھ کہہ سکے اور کبھی کبھی وہ ایسی بھی گفتگو کرتا ہے جس کے تحت وہ خیالوں کی ایک دنیا آباد کر لیتا ہے اور خود سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ لیکن مدرسے کے منزل پر جن مخصوص صلاحیتوں اور مہارتوں پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تقریری آوازوں کی صحیح صحیح ادائگی۔
۲۔ تقریری الفاظ کی صحیح صحیح ادائگی۔
۳۔ تقریری الفاظ کا صحیح صحیح تلفظ
۴۔ آوازوں پر قابو، آہنگ، لہجہ، اتار اور چڑھاؤ۔
۵۔ بولنے میں فطری انداز۔

تقریری انشاء

سماعت اور گفتگو دونوں تقریری انشاء کے اہم عنصر ہیں اس لیے مدرسے کے اندر ان کی بہتر تربیت کا انتظام ضروری ہے۔ تقریری انشاء کی نشو و نما کے لیے درج ذیل مشاغل تجویز کیے جا سکتے ہیں:

بات چیت یا گفتگو:

تقریری انشاء کی نشو و نما کے لیے بات چیت یا گفتگو بہت ضروری ہے۔ عام طور پر مدرسوں

میں اس کے لیے علاحدہ سے گھنٹے نہیں ہوتے لیکن ابتدائی درجات میں اگر گفتگو کے لیے بھی ایک گھنٹہ الگ سے فراہم کیا جائے تو بہت مفید ثابت ہوگا۔

مدرسے میں تقریری نشو و نما کرنے کی غرض سے بات چیت بالکل قدرتی اور فطری ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔ گھر، گاؤں، قصبہ یا شہر کے حالات، واقعات اور اشیاء سے متعلق گفتگو ہونی چاہیے اور اس ڈھنگ سے ہونی چاہیے کہ طالب علم بغیر کسی جھجھک کے اپنے مشاہدات بیان کر سکیں۔ طالب علم جب اپنے مشاہدات بیان کر رہے ہوں تو اس وقت کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی صحتِ زبان کے اصولوں کے تحت کسی قسم کی روک ٹوک ہونی چاہیے۔ بس بولنے کی مکمل آزادی ہو جس طرح وہ چاہیں اظہارِ خیال کریں۔

اس غیر رسمی گفتگو کے بہت سے موضوعات ہو سکتے ہیں۔ بچوں کے روزانہ مشاہدے اور تجربے میں آنے والی اشیاء سے متعلق موضوعات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ گاؤں کی پگڈنڈی، ہرے بھرے کھیت، قصباتی اور شہری زندگی کے مظاہر جن سے بچے کا واسطہ پڑتا ہے، غیر رسمی گفتگو کے موضوعات ہو سکتے ہیں۔

۲۔ فرضی کھیلوں سے متعلق گفتگو:

پہلی جماعت کے بچوں میں خصوصیت کے ساتھ فرضی کھیلوں کو بات چیت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ بچے کسی کھیل کے متعلق بات چیت کرنے کے مقابلے میں اس کھیل کو کھیلنا زیادہ پسند کرتے ہیں لہٰذا کھیل کے بعد یہ گفتگو کی جائے تو زیادہ دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔

۳۔ کہانی سنانا:

کہانی سننے اور سنانے کا مشغلہ چونکہ بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے اس لیے اس کو تقریری نشو و نما کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ کہانی سننے، سنانے کی کئی منزلیں ہیں۔ عمر اور جماعت کے لحاظ سے ان کا انتخاب کرنا چاہیے۔ پہلی جماعت کے بچوں کو پوری کہانی سنانا ایک مشکل امر ہے۔ اس لیے تصویروں کے ذریعے کہانی مکمل کرانی چاہیے، یعنی کہانی کے مختلف واقعات یا مناظر کی تصویریں دکھائی جا سکتی ہیں اور بچوں سے کہا جا سکتا ہے کہ ان تصویروں کے ذریعے کہانی بنائیں۔

ٹیلی ویژن سے بھی کبھی کبھار ایسے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جن میں تصویروں کے ذریعے کہانی مکمل کرائی جاتی ہے۔

دوسری منزل یہ ہے کہ استاد کہانی کے پس منظر میں کوئی جملہ بولے اور طالب علموں سے کہا جائے کہ وہ اگلا جملہ خود بولیں۔ اس طرح کہانی بڑھتی جاتی ہے اور کہانی میں نئے موڑ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ طلبہ کو تخلیقی اظہار کا بھرپور موقع ملتا ہے۔

تیسری منزل پر بچوں کو کہانی کا خاکہ دے دیا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس خاکے کو الفاظ سے پُر کریں۔ جس طرح تصویروں کے خاکے میں رنگ بھروائے جاتے ہیں اسی طرح کہانی کے خاکے کو لفظوں سے پُر کرایا جاتا ہے اور کہانی کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔

چوتھی منزل اور بھی دلچسپ ہے یعنی کہانی سناتے سناتے بیچ میں رُک جائیں اور طالب علموں سے پوچھیں۔ اچھا بتائیے پھر کیا ہوا؟ اس طرح کہانی میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ تمام باتیں اس اعتبار سے مفید ہوتی ہیں کہ ان کے ذریعے بچوں کے تخیل کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ مدرسے کی پرائمری سطح پر کہانیوں کا انتخاب کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے کہ اس منزل پر عام طور سے پانچ اور چھے سال کی عمر کے بچے مدرسے میں داخل ہوتے ہیں اور تقریباً دس سال کی عمر تک مدرسے میں رہتے ہیں۔ عمر کا یہ دور تخیلی دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں بچہ اُن کہانیوں میں دلچسپی نہیں لیتا جن میں حقیقی اظہار بیان ہو۔ وہ اب معلوم دنیا سے نکل کر افسانہ و افسوں کی دنیا میں قدم رکھتا ہے اور تخیل کی دنیا آباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ اب اس پُراسرار دنیا سے واقف ہونا چاہتا ہے جہاں ابھی تک اُس کی رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی حقیقی دنیا جس میں وہ چلتا پھرتا ہے اب تنگ نظر آتی ہے۔ اس کی طبیعت کو کچھ اور دنیا درکار ہوتی ہیں۔ گرد و پیش کی ہر چیز اس کو معمولی نظر آتی ہے اور اب وہ ایسی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے جس کا ہر ذرہ آفتاب و ماہتاب ہو۔ جہاں انسانوں کے پر لگ جاتے ہوں اور جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہوں۔ غرض وہ ایسی دنیا کا خواب دیکھنے لگتا ہے جس کی ہر شے سنہری ہو، خوبصورت اور چونکا دینے والی ہو، محیر العقل ہو چاہے وہ کوہ قاف کی پریاں ہوں، چاہے مازندران کے دیو ہوں، چاہے بالشتیے ہوں چاہے سینگ برادر انسان۔ غرض ایسے قصے جو

جو اُسے حیرت میں ڈال دیں۔ ایسے افسانوں کو پڑھ کر اُس عمر کا بچّہ کافی مسرور نظر آتا ہے۔ وہ ایسے قصّوں سے محظوظ ہوتا ہے جو دور دراز کے ممالک کے انسانوں، جانوروں، پرندوں اور پودوں کے متعلق ہوں جن کی ہستی اُن کی تخیل کی دنیا میں ایک قسم کی پُر اسرار رنگت پیدا کر دے۔ چاہے وہ آسٹریلیا کے کنگارو ہوں یا سائبیریا کے رینڈیر اور بہار کے راج ہنس۔ سب کے سب اس کے لیے معمّا ہوتے ہیں۔ سب کے سب اس کے لیے عجوبہ ہوتے ہیں اور ان سب کے متعلق وہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پرائمری درجات میں اساتذہ کو جن بچّوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ عام طور پر تخیلی دور میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں لہٰذا اساتذہ بچّوں کے لیے ایسی کہانیوں اور قصّوں کا انتخاب کریں جن میں تخیل کی پرواز کے کافی مواقع ہوں۔ ایسی ہی کہانیوں سے اس عمر کے بچّوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ان کے اخلاق کی بھی تربیت ہوتی ہے۔

پرائمری درجات کے آخری دو برسوں میں بچّہ تخیل کی دنیا سے باہر نکل آتا ہے اور بہادری، جُرأت نیز مہم جوئی کے کارناموں میں اُس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ یہ دور مخاطرات کا دور کہلاتا ہے اور اس دور میں بچّوں کو ایسی کہانیاں پسند آتی ہیں جن میں شجاعت کے معرکے سر کیے گئے ہوں۔ بھیم اور ارجن کی شجاعت اکبر اور شیر شاہ کی بہادری، رستم و سہراب کی جواں مردی، محبانِ وطن کی سرفروشی اور رہبرانِ قوم کے ایثار و قربانی کی داستانیں زیادہ پسند آتی ہیں۔

درج بالا ملحوظات کے پیشِ نظر پرائمری درجات کے لیے قصّہ گوئی کی تعلیم بے حد اہمیت رکھتی ہے لہٰذا قصّہ کہانیوں کے انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیے۔ بعض اربابِ فکر پریوں اور دیوؤں کے قصّے کو بچّوں کے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔ لہٰذا وہ ان قصّوں کو نصاب میں داخل کرنے پر معترض ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ابتدا میں ہمارے آبا و اجداد کی کوشش تھی کہ مظاہرِ قدرت کی توجیہہ پیش کریں چنانچہ اس کے لیے انھیں مافوق الفطرت قصّوں کا سہارا لینا پڑا لہٰذا موجودہ نسل کے بچّوں کو ایسے قصّے سنانے مناسب نہیں۔

مندرجہ بالا مباحث کے پیشِ نظر ابتدائی درجات میں سماعت اور گفتگو کی مناسب ترتیب کا انتظام ضروری ہے۔ گفتگو کی مشق، خواہ پڑھائی اور لکھائی دونوں کاموں میں

سہولت ہوتی ہے اور بچّے میں ذکاوت پیدا ہوتی ہے۔

گویائی کے نقائص:

بچّہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو مدرسے کا ماحول اس کے لیے اجنبی ہوتا ہے اور اس اجنبی ماحول میں تدریجی طور پر اس کو بولنے میں جھجک ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ مدرسے کا لسانی ماحول گھر کے لسانی ماحول سے کسی قدر مختلف ہوتا ہے زبان اور ماحول کا یہ فرق بچّے کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے فطری اظہار میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اُس کی گویائی میں بعض نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن گویائی کے بعض نقائص مدرسے میں قدم رکھنے سے قبل ہی رونما ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے استاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان نقائص سے کما حقہ واقف ہو اور ان نقائص کی اصلاح کے طور طریقے بھی جانتا ہو۔

ابتدائی سطح پر چونکہ مدرسے کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچّوں کو صاف اور شستہ بولنا سکھایا جائے اس لیے زبان کی تدریس کے پروگرام میں اس کو ایک مرکزی حیثیت دینی چاہیے اور مدرسے میں ایسا ماحول پیدا کرانا چاہیے جس میں بچّے فطری طور پر اظہار خیال کر سکیں اور اپنے مافی الضمیر کو سادگی اور صفائی کے ساتھ بیان کر سکیں۔ لہٰذا اُستاد کو گویائی کے نقائص کی اصلاح کے دوران بہت محتاط رہنا چاہیے اور یہ پہلو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ بچّوں کے فطری اظہار میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

گویائی کے نقائص عام طور پر دو اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ایک تو جسمانی نقص کی وجہ سے اور دوسرے لسانی اور جذباتی اسباب کی بنا پر بعض نقائص میں دونوں ہی عوامل کار فرما رہتے ہیں۔ ذیل میں ان نقائص کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی صورتیں بھی تجویز کی جاتی ہیں:

۱۔ غلط تلفظ ادا کرنا:

بچّوں کو بعض حروف کی ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے مثلاً س، ش، ج، ز، ف، ق کی آوازیں ٹھیک سے نہیں ادا ہو پاتیں۔ جیسے 'شعور' کو بچّہ 'سور' کہتا ہے یا 'شیشہ' کو 'سیسہ' کہتا ہے اسی طرح 'فوج' کو 'پھوج' کہتا ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہوتا ہے کہ دانتوں میں ناہمواری

ہوتی ہے اور ہونٹ اور جبڑے کی بناوٹ میں نقص ہوتا ہے اس لیے بچہ بعض آوازوں کو ٹھیک سے ادا نہیں کر پاتا۔

بعض اوقات لسانی اسباب کی بنا پر اس قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے اور ساری زندگی باقی رہتا ہے۔ 'ڈاکٹر' کو 'جاکر' کہنے والے 'جہاز' کو 'زہاز' کہنے والے 'شاکر' کو 'ساکر' کہنے والے بچے انھیں اسباب کی وجہ سے حروف کی صحیح آوازیں نہیں ادا کر پاتے ہیں۔

لسانی اسباب کی بنا پر گویائی میں جو نقص پیدا ہو جاتا ہے اس کی اصلاح کے لیے ماہرین نے کچھ مشقیں تجویز کی ہیں اور اساتذہ کو اس بات کا مشورہ دیا ہے کہ ان مشقوں سے گویائی کے نقائص کی اصلاح کی جا سکتی ہے یا مشقی جملے بار بار بچوں سے کہلوائے جا سکتے ہیں اور بچوں کو شستہ اور صاف بولنے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ ان مشقوں کو زبان توڑنے والی مشقیں بتلایا گیا ہے۔

تُتلانا:

غلط لاڈ پیار کے سبب بھی بعض بچوں کی گفتگو میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور وہ تتلا کر بولنے لگتے ہیں۔ کوئی صاحب کسی کے گھر ملنے آئے۔ چھوٹی بچی باہر نکلی، دیکھا ایک صاحب کھڑے ہیں اندر جا کر کہا "امی ایک تھاب ملنے آئے ہیں۔" ماں نے بھی پیار میں یہی جملہ دہرایا اور ایک صاحب کے بجائے ایک تھاب اس بچی کی زبان پر چڑھ گیا۔ اس کا سبب عام طور پر لاڈ پیار، شرمیلا پن اور اجنبی کے سامنے بولنے سے گھبراتا ہے۔ اس نقص کو بھی دور کرانے کے لیے اساتذہ کو چاہیے کہ ایسے بچوں کو زیادہ سے زیادہ اظہار کا موقع دیں اور بولنے میں ان کی ہمت افزائی کریں۔

ہکلانا:

ہکلانے کا نقص بھی بچوں میں عضویاتی اور سماجی اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ عضویاتی اسباب میں دانت اور جبڑے کی بناوٹ کا دخل ہوتا ہے۔ اگر استاد اپنی جماعت میں کسی بچے کو ہکلاتے ہوئے دیکھے تو سب سے پہلے اس کے والدین کو مشورہ دینا چاہیے کہ اس بچے کو کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہکلانے کا سبب عضویاتی ہے تو علاج کے لیے ڈاکٹر

سے رجوع کرنا چاہیے۔

لیکن ہکلانے کا اسباب جذباتی اور سماجی بھی ہوتے ہیں۔ کبھی جذباتی الجھن ہکلانے کا باعث بنتی ہیں اور کبھی ناکامی، مایوسی اور تفکرات ہکلانے کا سبب بنتے ہیں۔ استاد کو چاہیے کہ بچوں کو اظہار کا پورا موقع دیں اور بولتے وقت ان کی ہمت افزائی کریں۔

لسانی نامطابقت:

ماہرین لسانیات نے اس کو لسانی نامطابقت کا نام دیا ہے اور اسے گویائی کی ایک ایسی صورتِ حال سے تعبیر کیا ہے جس کو نارمل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح گویائی کا نقص دو اسباب سے پیدا ہوتا ہے، ایک سبب تو یہ ہے کہ دماغی نصف حصے کے فعل میں مہارت نہیں پیدا ہو پاتی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض مخصوص آوازوں کی ادائگی کی مہارت ناقص رہ جاتی ہے۔ اس میں کسی نامیاتی نقص کا دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ایک طرح کی نامطابقت ہوتی ہے اس کا سبب عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ سر میں کوئی چوٹ آئی ہو یا کسی مرض کی وجہ سر میں زخم پیدا ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر ہنری ہیڈ نے زخمی فوجیوں میں اس طرح کی علامتیں دریافت کی ہیں اور ان کی چار قسمیں بتائی ہیں (لیونارڈ بلوم فیلڈ ۱۹۸۰)

پہلی قسم کے تحت اس نقص میں مبتلا ہونے والا شخص اشیاء کے نام کا تلفظ غلط ادا کرتا ہے اور کبھی کبھی اس حد تک انتشار میں مبتلا ہوتا ہے کہ سوالات کے جواب میں محض ہاں یا نہیں کہنے پر اکتفا کرتا ہے اور اس وقت تک صحیح تلفظ نہیں ادا کر پاتا جب تک کوئی دوسرا شخص بول کر نہ بتائے۔

دوسری قسم کا بولنے والا صاف بولتا ہے، تلفظ بھی صحیح ادا کرتا ہے، مختصر فقرے بولتا ہے لیکن فقروں کی ساخت ٹھیک نہیں ہوتی اور بعض صورتوں میں گفتگو کی صرفی و نحوی ترتیب میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم کے تحت اشیاء کے صحیح نام دریافت کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس میں تلفظ کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور نہ ہی الفاظ کی ترتیب میں فرق ہوتا ہے۔ بس اشیا کے نام نہیں مل پاتے مثلاً قینچی کا لفظ اس کو یاد نہیں آ پاتا اور وہ کہنے لگتا ہے "ارے بھائی وہ جس سے کپڑا کاٹتے

کے نام بھول جاتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ صورت حال نارمل آدمیوں میں بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن نارمل اشخاص میں اس کا سبب جوش یا گھبراہٹ یا ذہنی تکان ہوتی ہے۔

چوتھی صورت حال کے تحت اس نقص گویائی میں مبتلا ہونے والا شخص کوئی مربوط جملہ نہیں کہہ پاتا۔ کبھی وہ مناسب لفظ کی تلاش میں ناکام رہتا ہے اور کبھی اشیا سامنے رہنے کے باوجود شناخت نہیں کر پاتا۔

دراصل تقریر یا گویائی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے جس کے تحت ہر قسم کا ہیجان، منہ اور گلے کے بعض مخصوص عمل کا باعث بنتا ہے اور آلۂ نطق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے سر کی کوئی بھی چوٹ گویائی میں انتشار پیدا کر سکتی ہے۔

وہ ہیجان جو گویائی پیدا کرتا ہے مختلف قسم کے ردعمل کا باعث ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض باہر سے نظر نہیں آتے۔ خاص طور سے عصبی اور غدودی ردعمل۔ دوسرے قسم کے ردعمل یعنی حرکی ردعمل مثلاً کسی چیز کو ہاتھ میں لے کر کھیلنا اور تیسرے قسم کے ردعمل جو ساخت کے لیے ہیجان کا کام کرتے ہیں، نارمل صورت حال کا مظہر ہوتے ہیں جن کے تحت بولنے والے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ، آواز، لہجہ، آواز کے نشیب و فراز اور حرکات و سکنات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

زبان کے استاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان رموز سے بھی کسی قدر آشنا ہو تاکہ بچوں میں گویائی کے نقص کی شناخت کر سکے اور اُن کی اصلاح بھی کر سکے۔

... وقت سمجھنے والے کے خیالات سے آگاہی پیدا کی جاتی ہے اور اس مواد کی تفہیم میں مدد ملتی ہے جو اس عبارت میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا پڑھنا لفظوں کو صرف زبان سے ادا کر دینے کا نام نہیں بلکہ یہ آموزش کا ایک پیچیدہ تجربہ ہے۔

پڑھائی کا عمل مقصود بالذات نہیں کہ اس کے ذریعے محض مہارت یا فن سکھا لیا جائے بلکہ اس کا مقصد زیادہ وسیع ہے۔ پڑھائی کے ذریعے بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا جاتا ہے ان میں خود اعتمادی پیدا کی جاتی ہے اور اس بات کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ پیش آنے والے مسئلوں کو سہولت کے ساتھ حل کر سکیں۔

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ پڑھنا ایک معمولی اور آسان عمل ہے جس کے لیے کسی خاص جتن کی ضرورت نہیں۔ اس کے تحت محض حروف کی آوازوں کو سیکھ لیا جاتا ہے، انھیں پڑھ کر ادا کر دیا جاتا ہے اور لفظوں اور جملوں میں ان کی تکرار کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ تصور صحیح نہیں بلکہ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے بارے میں ماہرین لسانیات، ماہرین نفسیات اور ماہرین عضویات نے پوری تحقیق کی ہے اور تحقیق کی بنیاد پر اپنے نظریات پیش کیے۔ ان ماہرین نے ایسی تکنیکی معلومات فراہم کی ہیں جن سے اس پیچیدہ عمل کی عقدہ کشائی میں مدد ملتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر نام ولیم. ایس. گرے کا ہے۔ موصوف نے تمام عمر پڑھائی کی باریکیوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پڑھائی کے

ہم املا کیسے پڑھائیں

عمل کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ بچے کے سامنے ایک کتاب رکھی ہے جس کے صفحات پر کچھ لفظ اور جملے
چھپے ہوئے ہیں اور بچے سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ چھپے ہوئے اُن لفظوں کو پڑھے گا۔ بچہ پڑھنا
شروع کرتا ہے۔ اُس کی آنکھیں چھپے ہوئے الفاظ کو دیکھتی ہیں۔ اردو میں چھپائی چونکہ دائیں سے
بائیں جانب ہوتی ہے اور نظر مختلف مقامات پر ٹھہرتی جاتی ہے اس طرح ایک ایسا ارتقائی
عمل وقوع پذیر ہوتا ہے جس کے تحت دماغ تک پیغام رسانی ہوتی ہے۔ اس عمل میں تکرار ا
مشق کا عمل برابر شامل رہتا ہے۔ اگر بچے نے لفظ کو کئی بار دیکھا ہے تو لفظ اور صوت دونو
کا ابلاغ بیک وقت ہوتا جاتا ہے۔ اصطلاحی زبان میں اس کو بصارتی لفظ کہہ سکتے ہیں۔ ا
کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر پڑھنے والا نظر سے لفظ کی شناخت نہ کر پائے تو
بصارتی لفظ نہیں کہلائے گا۔ ایسی صورت میں استاد کو چاہیے کہ وہ طالب علم کو لفظ کی شناخ
کے مختلف طریقے بتائے تاکہ پڑھنے والا خود لفظ کی شناخت کر سکے۔

پڑھنے والا جوں جوں جملے میں لفظ کی شناخت کرتا جاتا ہے جملے کے اختتام پر اخ
مفہوم کا کام سہل ہوتا جاتا ہے۔ پڑھتے وقت جوں جوں الفاظ کا اضافہ ہوتا جاتا ہے پورا
جملہ پڑھنے کے بعد لفظ اور جملے کا رشتہ خود بخود واضح ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح جملے کے بع
جملہ پڑھتے وقت مفہوم میں توسیع ہوتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جملے سے جملے جڑتے
جاتے ہیں اور پارہ بندی ہوتی جاتی ہے۔ پڑھنے والا جملے کے اختتام پر خود فیصلہ کرتا ہے کہ
جملے میں جو بات کہی گئی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ وہ پڑھنے والے کے تجربے سے مطابقت
رکھتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ بات امرِ واقعہ پر مبنی ہے تو تجربے سے تطابق ہونا چاہیے اور اگر اس
کا استعمال تمثیلی اور مجازی ہے تو اس صورت میں امرِ واقعہ سے مطابقت ممکن نہیں۔ مثال
کے طور پر یہ جملہ لے لیجیے: "مور کا پنکھ بہت خوبصورت ہوتا ہے" اس جملے کو پڑھتے وقت
پڑھنے والے کا تجربہ اس کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ بات کو سمجھ لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ جملہ
اس طرح ہو "اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں" تو اس جملے کو پڑھنے والا
اپنے تجربے سے جب امرِ واقعہ کی مطابقت کرتا ہے تو اس کو ناکامی ہوتی ہے۔ یہاں یہ امر
واقعہ نہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورا اترے بلکہ یہ ایک مجازی اور تمثیلی اظہار ہے اور الفاظ
کے لغوی معنی سے ہٹ کر استعارے کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا جملے کے اختتام پر محسوس کرتا ہے کہ ان

یعنی [...] جذباتی ردِّ عمل [...] ہوتی۔ البتہ جملہ پڑھنے کے بعد وہ جذباتی ردِّ عمل سے دوچار ہوتا ہے اس لیے کہ جملے میں کسی معاملے سے متعلق کوئی رائے یا کوئی خیال پیش کیا گیا ہے۔ پڑھنے والے کو اس سے اتفاق ہو سکتا ہے یا اختلاف وہ جملے کی تلخی محسوس کر سکتا ہے یا جملے سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور پڑھنے والے کی ترقی کے ساتھ ساتھ پڑھائی کے حوالے میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کی سطحیں بدلتی جاتی ہیں۔ گرے نے پڑھائی کے پورے عمل کی کئی منزلیں بتائی ہیں۔ جس سے تفہیم کے عمل میں وسعت ہوتی جاتی ہے۔ پہلی منزل ادراک کی منزل ہے جس میں پڑھتے وقت چھپے ہوئے الفاظ کو دیکھنا، پڑھنا اور صوت و معنی کی شناخت کا عمل شامل ہے۔ اس کے بعد سیاق و سباق کی منزل آتی ہے جس کے تحت جملے میں لفظ بہ لفظ شناخت کرنا اور پورے جملے کے سیاق و سباق میں مفہوم سمجھنا شامل ہوتا ہے۔ یہ کسی قدر پیچیدہ عمل ہے لیکن اس سے بھی پیچیدہ منزل وہ ہے جس میں طالب علم اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اس منزل پر پڑھنے والا جملے کی بات کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ پھر اس کی صحت اور عدمِ صحت کا تعین کرتا ہے اور اگر اظہار مجازی ہے۔ یا مصنف نے جملے یا عبارت میں کوئی رائے پیش کی ہے تو اس سے اتفاق یا اختلاف کے ذریعے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ یہ تفہیم کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کا حصول ثانوی اور اعلیٰ ثانوی منزل پر ہی ممکن ہے۔

دراصل ابتدائی منزل کے اساتذہ کے لیے یہ ایک نہایت ہی اہم کام ہے بلکہ ایک قسم کا چیلنج ہے کہ کس طرح وہ اپنے طالب علموں کو پڑھائی کی جانب راغب کرائے اور پڑھائی کا شوق پیدا کرائے تاکہ طالب علم پڑھائی کے عمل میں مہارت حاصل کر سکے۔ کلاس میں استاد کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ پڑھائی کی مہارت پیدا کرنے میں اپنے شاگردوں کی مدد کرے۔

پڑھائی کی پس ماندگی:

پڑھائی کی اہمیت محض زبان کی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ دیگر مضامین میں بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے اس لیے اساتذہ کو عام طور پر اور ابتدائی مدارس کے استادوں کو خاص طور سے اس بات کی شعوری کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے شاگرد پڑھائی کی بہتر صلاحیت

پیدا کر سکیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ پڑھائی میں بچے کمزور ہوتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ
ہے کہ بنیادی منزل پر یعنی پڑھائی سکھانے کی منزل پر اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر طالب علموں میں پڑھائی کی بنیادی مہارتیں پیدا نہیں ہو پاتیں۔
اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ طالب علم میں پڑھائی کی پس ماندگی اور اس کی شخصیت
کی نشوونما میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اس بات کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ پڑھائی
کی پس ماندگی، سماج دشمن کردار کی نشوونما کا بھی سبب بنتی ہیں۔ بیشتر لوگوں کا یہی
خیال ہے کہ پڑھائی کی ناکامی سے بگڑے ہوئے [illegible] کا بھی گہرا تعلق ہے۔ خاص طور سے ابتدائی
منزل پر دیکھا گیا ہے کہ پڑھائی میں کمزور ہونے کی وجہ سے بچے مدرسے سے بھاگنے لگتے
ہیں۔ اس بات سے تو عام طور پر اساتذہ واقف ہوں گے کہ ابتدائی مدارس میں فیل ہونے
اور ایک ہی جماعت میں ایک برس سے زائد مدت گزارنے میں جو عوامل کارفرما ہوتے
ہیں ان میں پڑھائی کی کمزوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان عوامل کا
ترتیب وار ذکر کیا گیا ہے۔

انفرادی فرق:

پڑھائی کا آغاز کرتے وقت ہر بچہ ایک ہی جسمانی اور جذباتی کیفیت کا حامل نہیں
ہوتا بلکہ ان کے اندر انفرادی فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر بچے کا سماجی پس منظر بھی مختلف
ہوتا ہے۔ خاندان اور ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح انفرادی اور ماحولی فرق کی وجہ سے ہر بچہ
علاحدہ علاحدہ پڑھائی کی دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے۔ لہٰذا پڑھنا سکھاتے وقت
انفرادی فرق اور ماحول کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کوئی بچہ جلدی پڑھائی شروع کرتا
ہے تو کوئی بعد میں۔ کوئی بچہ پڑھائی میں جی لگاتا ہے تو کوئی جی چراتا ہے۔ کسی کو پڑھائی
میں لطف محسوس ہوتا ہے تو کسی کو اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

جنس کا فرق:

جنس کی بنیاد پر بھی بچوں کی پڑھائی میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ
لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں جلدی پختگی حاصل کر لیتی ہیں اور لڑکوں [illegible]
پہلے بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ بھی علاوہ [illegible]

بچیاں زیادہ باتونی رہتی ہیں اس فن کے ماہرین نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں میں پڑھائی کی معذوری بہت کم نظر آتی ہے۔ مغربی ملکوں کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسے میں داخلے کے وقت لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں زیادہ پڑھائی پر آمادہ نظر آتی ہیں۔

ماحول کا فرق:

ماحول کا فرق دو اعتبار سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تو سماجی، معاشی اور تہذیبی اعتبار سے اور دوسرے گھر اور مدرسے کے ماحول میں فرق کی وجہ سے پڑھائی کی کارکردگی پر بہت اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے پس ماندہ طبقے میں پڑھائی کی کارکردگی بہت کم ہوتی ہے۔ اس طبقے کے بچوں کے پاس وہ وسائل نہیں ہوتے جو متوسط یا اعلیٰ طبقے کے بچوں کو میسر آتے ہیں۔ متوسط اور اعلیٰ طبقے کے بچوں کے مقابلے میں انہیں گھریلو سہولتیں بھی کم میسر آتی ہیں۔

ماحول کی اجنبیت بھی پڑھائی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ گھر اور مدرسے کے ماحول میں چونکہ بہت فرق ہوتا ہے اس لیے شروع شروع میں بچہ خود کو مدرسے کے اندر اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ بچوں کی اجنبیت کو دور کرنے کے لیے گروہی مشاغل کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت بچے چھوٹے چھوٹے گروپ میں کھیلتے ہیں اور کھیل کے دوران ان کی اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔ گروہی کھیلوں میں بچہ خود کو نئے سماجی ماحول سے ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ مل جل کر گانے، کہانیاں سنانے، تصویروں کے ذریعے کہانی سنانے اور گرد و پیش سے متعلق بات چیت کرنے سے بھی بچوں میں اظہار ذات کی صلاحیت اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔

بچے کی صحت:

بچے کی صحت اگر خراب ہو تو بھی پڑھائی کی کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ اگر بچے کی ناک میں تکلیف ہو یا تنفس میں دشواری محسوس ہوتی ہو یا عام صحت خراب ہو تو پڑھائی میں مشکل سے جی لگتا ہے۔ بچوں کی بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے بھی [illegible]

تجھے ہوتا ہے کہ بچہ پڑھائی سے گریز کرنے لگتا ہے۔ بعض مشاہدوں سے پتا چلتا ہے کہ بائیں ہتھے بچے عام طور پر پڑھائی میں کمزور ہوتے ہیں لیکن ابھی تک یہ بات متنازعہ فیہ ہے اور وثوق کے ساتھ اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بائیں ہتھے بچے پڑھائی میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

پڑھائی کا آغاز:

پڑھائی کے سلسلے میں جو مطالعے ہوتے ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ دوسرے کی منزل ہر کسی بھی جماعت میں پڑھائی کی جن دشواریوں سے بچے کو سابقہ پڑتا ہے اس کا سراغ پہلی جماعت میں اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب بچہ پڑھائی کی ابتدائی کوششوں میں مصروف ہوتا ہے۔ عام طور پر ابتدائی مدارس میں پانچ چھے برس کی عمر کے بچے پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں اور کم و بیش اسی وقت پڑھائی کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن داخلے کی عمر میں فرق، پختگی کی رفتار میں فرق، انفرادی فرق اور ماحول کے فرق کی وجہ سے سیکھنے کی رفتار میں فرق ہوتا ہے۔ بعض بچے آغاز میں پڑھائی شروع کر دیتے ہیں اور بعض پس ماندہ رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو مطالعے ہوتے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسکول میں داخلے کے وقت طلبہ کی اچھی خاصی تعداد پڑھائی کی طرف توجہ نہیں کر پاتی۔ بعض ابتدائی مدارس میں دیکھا گیا ہے کہ بعض بچے گھر ہی سے پڑھائی کا آغاز کر کے آتے ہیں۔ ایسے بچوں کو پڑھائی شروع کرنے میں سہولت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ پڑھائی کے میکانکی عمل سے روشناس ہو چکے ہوتے ہیں۔

پڑھائی شروع کرانے کی صحیح عمر کیا ہو؟ اس سے متعلق جو مطالعے ہوتے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ذہنی جانچ کے نتائج اور پڑھائی میں کامیابی کے درمیان ربط پایا جاتا ہے اور پڑھائی شروع کرانے کی صحیح اور مناسب ذہنی عمر ساڑھے چھے سال ہوتی ہے۔ لہذا پڑھائی کے کام کو اس وقت تک موقوف رکھا جائے جب تک بچہ ساڑھے چھے سال کا نہ ہو جائے۔ تحقیقی مطالعوں سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ساڑھے چھے برس سے کم ذہنی عمر کے بچے بھی کامیابی کے ساتھ پڑھائی کا آغاز کر لیتے ہیں بشرطیکہ استاد توجہ سے کام لے اور پڑھائی کے کام کو دلچسپ بنا کر پیش کرے۔ نفسیات کے ایک ماہر اے۔ آئی۔ گیٹس نے پڑھائی کے سلسلے میں جس بات کو زیادہ اہمیت دی ہے وہ بچے کی ذہنی عمر نہیں ہے بلکہ وہ تعلیمی پروگرام ہے جو بچے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے

ساتھ پڑھائی کا آغاز کر سکتا ہے۔

پڑھائی کی آمادگی:

پڑھائی کی آمادگی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے تمام اسکول دوچار ہیں اگر یہ دریافت کرنے کی کوئی صورت نکل آئے کہ داخلے کے وقت کتنے فی صد بچے پڑھائی کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور کتنے فی صد پڑھائی سے بیزار نظر آتے ہیں تو شاید اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی سبیل ڈھونڈی جا سکے۔ اس طرح اس بات کی جانکاری بھی مفید ثابت ہوگی کہ پڑھائی کے آغاز میں جسمانی، ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا رہتی ہے۔ ان سب باتوں کا پتا لگانا ضروری ہے اور اس کے لیے تحقیق مطالعے کی بہت ضرورت ہے تاکہ پڑھائی سے متعلق اساتذہ کی معقول رہنمائی کی جا سکے۔ والدین کو بھی پڑھائی سے متعلق ضروری باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ ان تمام نظری نکتوں سے قطع نظر عملی بات تو یہ ہے کہ مدرسے میں جب بچہ داخل ہو تو اس کو پڑھنا سکھایا جائے اور اس میں پڑھائی سے متعلق ضروری مہارتیں پیدا کی جائیں۔

پہلی جماعت میں طلبہ کی پڑھائی کی آمادگی پیدا کرانے میں استاد جماعت کی بڑی ذمہ داری ہے۔ استاد کو چاہیے کہ اس کے لیے مخصوص طور پر پڑھائی کا پروگرام مرتب کرے۔ ایسے پروگرام جن کے تحت طالب علموں کو مدرسے کے ماحول سے مانوس کیا جا سکے۔ بچے کے گھر اور مدرسے کے ماحول میں فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کے ماحول کو اور خاص طور سے کلاس کے ماحول کو جس قدر گھر کے ماحول کے قریب لایا جا سکے اسی قدر بچہ کلاس سے مطابقت پیدا کر سکے گا۔ ہمارے گاؤں میں چونکہ نرسری اسکول نہیں ہوتے اور شہروں میں بھی یہ سہولت بہت تھوڑے سے طالب علموں تک محدود رہتی ہے اس لیے بچوں کو عام طور پر نرسری اسکول کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا چنانچہ ابتدا میں کلاس کے ماحول سے مطابقت پیدا کرانے میں اور بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

مدرسے میں داخلہ لینے کے بعد بھی بچہ خوف و ہراس میں مبتلا رہتا ہے، بات کرتے ہوئے گھبراتا ہے، استاد سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اس پر ایک طرح کی دہشت طاری رہتی ہے اور ہر وقت وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ کب چھٹی ملے اور گھر کو بھاگے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال پڑھائی کے لیے سازگار ماحول نہیں پیدا کر سکتی۔ پڑھائی چونکہ ایک پیچیدہ عمل ہے اس لیے اس پر بہت توجہ اور احتیاط کی

ضرورت ہے۔ لہٰذا استاد کو چاہیے کہ پڑھائی شروع کرانے کے قبل پڑھائی کی تیاری کرے۔ پڑھائی کی آمادگی اور پڑھائی کا شوق پیدا کرانے کے لیے درج ذیل مشاغل تجویز کیے گئے ہیں۔ ایک ہوشیار استاد ان مشاغل کا اہتمام کرکے اپنے طالب علموں میں پڑھائی کا شوق پیدا کر سکتا ہے۔

۱. چڑیوں کا مشاہدہ
۲. جانوروں کا مشاہدہ
۳. درختوں کا مشاہدہ
۴. دریا، میدان اور جنگل کا مشاہدہ
۵. باغبانی کرانا
۶. سبزی اگانا
۷. سیر سپاٹا کرانا
۸. کھیل کود
۹. نقلیں کرانا
۱۰. ڈرامے کرانا

اور اس طرح کے دیگر مشاغل بچوں کے لیے دلچسپ تجربے فراہم کرتے ہیں۔ تجربات کی رنگارنگی اور دل کشی بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے اور ان کے تصورات میں صفائی پیدا کرتی ہے۔ ان مشاغل کے ذریعے پڑھائی کے دوران بچوں کے مبہم تصورات واضح ہو جاتے ہیں۔